سربکف

سوانح حیات کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید تمغہ بسالت

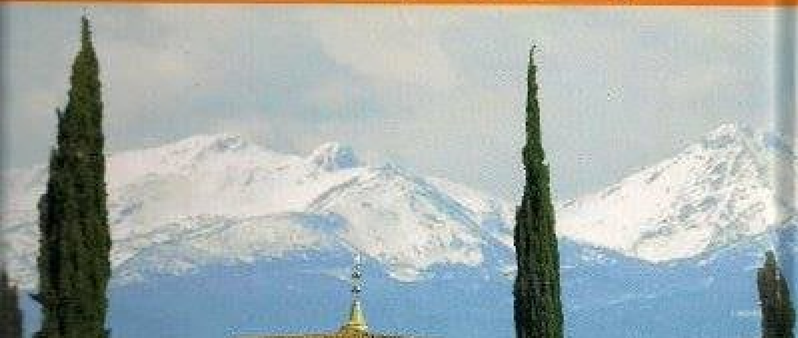

انوار ایوب راجہ

﴾بسم اللہ الرحمٰن الرحیم﴿

حرف اوّل

فرمان خداوندی ہے کہ میں نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا تا کہ تم اپنی پہچان کر سکو۔ بعض قومیں پیشوں کے لحاظ سے بھی جانی جاتی ہیں مگر یہ ان کی اصل حقیقت نہیں۔ زمانہ قدیم وجدید میں بسا اوقات ایسے بھی ہوا کہ افراد نے اپنے پیشوں کے لحاظ سے اپنی قومیت ہی بدل لی یا پھر ان پیشوں سے منسلک بعض افراد کی شہرت سے متاثر ہو کر ان کی قومیت اپنالی۔ مادی شہرت کے حصول کیلئے قومیت بدلنا حدیث نبوی ﷺ کے لحاظ سے درست نہیں مگر موجودہ دور میں اکثر افراد اور اقوام نے کمتر پیشوں کی وجہ سے اپنی قومیت بدلنے میں فخر محسوس کیا ہے۔ تاریخ اقوام میں ایسی بھی بیسیوں مثالیں موجود ہیں کہ افراد اور خاندانوں کی نقل مکانی اور دوسری اقوام میں کثرت سے بیاہ شادیوں کی وجہ سے بھی اکثر افراد اپنی قوموں اور قبیلوں کی پہچان سے محروم ہو جاتے ہیں۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ ایشیائ اور افریقہ ہی میں خاندان، قبیلے اور برادری کا رواج ہے جبکہ یورپ میں ایسا نہیں۔ یہ مفروضہ کم علمی اور تاریخ اقوام عالم سے بے خبری کا باعث ہے۔ جس طرح ہر زمانے میں اللہ نے اقوام کی ہدایت کے لئے نبی، رسول اور پیغمبر بھیجے ویسے ہی افراد کی اقوام میں تقسیم بھی ایک قدرتی امر ہے۔ بحیثیت انسان افراد کی برابری اور مساوات سے کسی کو انکار نہیں جبکہ برتری کا باعث قدرت کے قانون کے مطابق صرف تقویٰ و پرہیز گاری ہے اور یہی قابل فخر بات بھی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ سے یہی ثابت ہے کہ بہتر شخص وہی ہے جو تقویٰ و پرہیز گاری میں بڑھ کر ہے۔ تاریخی واقعات بھی ہمیں یہی درس دیتے ہیں کہ نیکی، پرہیز گاری اور خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والے افراد، قبائل اور اقوام کا نام ہمیشہ رخشندہ رہا جبکہ جبر وظلم، برائی و بے حیائی کے مرتکب افراد اور اقوام کا عروج کبھی قائم نہیں رہا اور نہ ہی تاریخ نے ان اقوام کے کارناموں کو فخریہ انداز سے بیان کیا ہے۔

قوموں، برادریوں اور قبیلوں کے اچھے کارناموں سے افراد کے کردار کی بہتر نشوونما ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ بیٹا باپ کا پیشہ اختیار کرے مگر وہ باپ، دادا، نانا، ماں، دادی یا پھر نانی کی کچھ خصلیات وعادات کو ہر حال میں اپنا لیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک غریب اور مفلوک الحال بچہ ایک

امیرزادے یا پھر بظاہر اعلیٰ حسب ونسب کے حامل بچے کی نسبت زیادہ باادب، باکردار غیرت منداور باجرأت ہو۔ قبیلے، برادری اور نسل کا تعلق انسان سے ایسے ہی ہے جیسے نباتات کا زمین سے۔ یورپ اور امریکہ میں حالیہ تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ اچھے والدین ہی اچھی قوم کی بنیاد ہیں۔ دولت کے انبار، ہتھیاروں کی جدید اقسام اور مقدار کبھی کسی قوم کو زوال سے نہیں بچا سکتی جبکہ کردار اور خصائل کی مضبوطی غریب اور مفلوک الحال قوم کے لئے عروج اور خوشحالی کی سند اور ضمانت ہے۔

امریکہ کے صدر جارج بش جونیئر نے اپنے ابتدائی خطبہ صدارت میں بچوں کے کردار پر سب سے زیادہ زور دیا اور کردار کی مضبوطی ہی کو امریکن قوم کے لئے معیار قرار دیا۔ حیرت ہے کہ جس امر پر آج مغربی اقوام سب سے زیادہ زور دے رہی ہیں اور اس پر جدید ریسرچ کے زمرہ میں کثیر رقوم خرچ کر رہی ہیں اسے مسلم صوفیائ اور دیگر مشرقی محققین نے صدیوں پہلے مختصر الفاظ اور بامعنی فقرات واشعار میں دلیل کے ساتھ بیان کیا۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ میں معلّم اخلاق ہوں۔ اخلاق کے وسیع تر معنی انسانی کردار وعظمت ہی کی تشریح کرتے ہیں۔ بھگت کبیؔر نے کہا باپ پر بیٹا نسل پر گھوڑا جبکہ پنجابی کے مشہور شاعر حضرت میاں محمد بخشؒ نے فرمایا کہ جس طرح کڑوی بیل پر کڑوا پھل ہی لگتا ہے ویسے ہی ماں کے کردار کا اولاد پر اثر ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی نبی، رسول، پیغمبر، مصلحے اور اولیائ کاملین آئے سب کے سب تعمیر کردار کا درس ہی دیتے رہے چونکہ کردار کے بغیر کوئی قوم، قبیلہ یا برادری اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ جس طرح آگ کا کردار جلانا اور برف کا ٹھنڈک پہنچانا ہے ویسے ہی کردار قوموں اور قبیلوں کے اچھے اور برے خصائل کا ضامن ہے۔ خاندانی اوصاف فرد کے کردار کا عکاس ہوتے ہیں اگر ایک اچھے کردار واوصاف کے حامل فرد کو اچھی صحبت اور اچھی درس گاہ اور استاد بھی میسر ہو تو وہ اس کے کردار کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ ایسے ہی افراد اور قبائل سے ریاست مضبوط اور قومیں خوشحال ہوتی ہیں اور ان اقوام اور افراد کے کارناموں کا نام تاریخ ہے جو آئندہ نسلوں کے لئے روشن رائیں مرتب کرتی ہے جسے اپنا کر قومیں اور ملک اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔

عمرانیات کا مسلمہ اصول ہے کہ جس شخص کو اپنی تاریخ سے ناواقفیت ہو وہ دیگر علوم وفنون میں کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو وہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بقائے حیات قومی کے لئے تاریخ کا علم ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ علم معاش۔

قوموں، قبیلوں اور افراد کے کارناموں، کردار، اوصاف، تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا نام

تاریخ ہے۔ یہی کارنامے، قصے اور کہانیاں جب فن تحریر کے ماہرین کے قلم کی زد میں آتے ہیں تو ادب ولٹریچر کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ یہی ادب روایات کی شکل میں نسل در نسل منتقل ہوتا تاریخ کی عمری طوالت اور تقدس کا باعث بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعصب و بغض سے پاک تحریریں ہمیشہ امر ہو جاتی ہیں جبکہ حاسد و متعصب قلم کار اور سطحی سوچ کے حامل محقق و تاریخ دان اپنی تمام تر کوششوں اور تاریخ کے من گھڑت حوالوں کے باوجود تاریخی حقائق کی اصل شکل کو مسخ نہیں کر سکتے بلکہ وقت کا پہیہ ہمیشہ حقیقت کے زاویئے پر ہی آ رُکتا ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" میں رامائن اور مہابھارت کی تاریخ، افسانوں اور کہانیوں پر حیران ہیں کہ صدیاں بیت جانے کے باوجود کروڑوں لوگوں کا عقیدہ ان قصوں پر پختہ سے پختہ ہی ہوتا گیا ہے۔ ذہین و فطین برہمنوں سے لیکر ایک ادنیٰ درجے کے ان پڑھ چرواہے پر بھی ان کہانیوں کی چھاپ لگ گئی ہے۔ اسی طرح یورپ اور امریکہ میں آج بھی مائیں اپنے بچوں کی ذہنی نشو ونما کے لئے انہیں میدان جنگ میں جوہر دکھانے والے اصلی اور فرضی ہیروز کی داستانیں سناتی ہیں اور ان ہیروز کا ذکر گیتوں اور لوریوں سے لیکر کارٹونوں تک پھیل چکا ہے۔ پنڈت نہرو کے مطابق پنج تنترا اور الف لیلیٰ کے قصوں میں کوئی صداقت نہیں مگر اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان قصوں سے ملتا جلتا کوئی کردار کبھی ماضی بعید میں ہوا ہو یا پھر ان قصوں اور کہانیوں سے متاثر کوئی کردار حال یا پھر مستقبل میں سامنے آ جائے۔ قصہ سیف الملوک کے مصنف حضرت میاں محمد بخشؒ نے اس قصے کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ جب مجھے شہزادہ سیف الملوک کا کردار مل گیا تو اس قصے کو آگے بڑھانے کے لئے مجھے پریوں کی بھی ضرورت پڑی۔ میں نے تخیل کی دنیا میں پریوں کا میلا سجایا اور جن کے اوصاف اور چال چلن درست پائے انہیں قصے کی زینت بنا کر باقی کو رخصت کر دیا۔ ہندی دیو مالائی کہانیوں کا عمیق مطالعہ اس بات کا شائد ہے کہ یہ دیو مالائی قصے رامائن اور مہابھارت تک محدود نہیں بلکہ چندر گپت اور چانکیہ کوتیلیہ سے کئی صدیاں پہلے سنکرت لٹریچر شاعری اور تاریخی اخلاقیات پر مبنی قصوں اور کہانیوں سے معمور تھا۔ ان کہانیوں میں نیکی اور بھلائی کے ساتھ ساتھ المیاتی اور رومانوی کردار بھی بڑے واضح تھے۔ اشوک اعظم کے دور میں ایک ایسے درخت کا قصہ مشہور تھا جو اس وقت پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتا جب کوئی نیک خاتون اپنے گھر سے باہر آتی۔ آچاریہ حکمران عورت کی نیکی اور پارسائی

کوقدرت کاتحفہ سمجھتے چونکہ عورت کے بطن سے ہی اچھے حکمران اور صالح انسان پیدا ہوتے ہیں۔ ہندی دیو مالائی قصے اور کہانیاں محض افسانوی نہیں بلکہ حقیقت کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ان کہانیوں اور تاریخی واقعات نے روایتی بہادرانہ کارناموں اور تہذیبی تصورات کا ایسا روپ دھارا جو برصغیر پاک و ہند کے بعض قبائل کے لئے سماجی ضابطے اور قوانین بن گئے۔ یہ ضابطے، روایات اور رسومات ہی ہیں جنہوں نے مشرقی تہذیب کو زندہ رکھا اور ان روایات و رسومات کی زندگی ان بہادر سور ماؤں کی مرہون منت ہے جنہوں نے آزادی وطن اور حرمت دین کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرتے ہوئے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تا کہ تہذیب و روایات کا شجر سدا بہار رہے۔ یونانی، ہندی، رومن، ایرانی، چینی، مصری، دیو مالائی قصے کہانیاں ان ہی بہادروں، صالح اور نیک انسانوں کی زندگی کے مختلف انداز ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے زندگی کی راہیں متین کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ بنے۔ ہومر کی اڈیسی اور ایلیڈ عرب کی انتارہ، بھارت کی پنچ تنترا، مہابھارت اور رامائن، میاں محمد بخشؒ کا سیف الملوک، شاہ لطیفؒ کا شاہ جو رسالوں، اقبال کی بانگ درا، سلطان باھو کی ابیات، غنی کشمیریؒ کا رسم خیال، خلیل جبران کی پیغمبر ، وارث شاہ کی ہیر اور کنفیوشس کی لون یو میں کہیں نہ کہیں مطابقت ضرور ہے۔ مختلف مذاہب و خیالات کے ساتھ ساتھ زمان و مکان کا فرق و تقسیم انسانی اقدار اور اچھی روایات میں کوئی تفریق نہیں کر سکا چونکہ انسان کی پیدائش کا مقصد ہی نیکی اور بھلائی ہے۔ عبادت الٰہی تزکیہ نفس اور برائی کے خلاف جہاد، عبادات، ریاضت، تزکیہ و مجاہدہ کے طریقوں سے ہم اختلاف نہیں کر سکتے چونکہ ہر زمانے کے رسم و رواج کا کچھ نہ کچھ اثر انسان کی ظاہری زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی باطنی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔

ان روایات سے اختلاف کر کے سرمو ان سے انحراف تاریخ کے حسن پر قدغن لگانے کے مترادف ہوگا۔ جو قومیں اپنی تاریخ سے ناواقف ہوں اور اپنے ہیروز اور سور ماؤں کے کارناموں کو بھول جائیں، ان کی اچھی روایات کو آگے نہ بڑھائیں وہ مادی ترقی کے باوجود ذہنی اور اخلاقی تنزلی کا شکار ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ زیرنظر تحریر بھی تاریخ کی تجدید کے ساتھ ساتھ ایک ایسے نوجوان کی زندگی کے کارناموں سے مزین ہے جس نے اپنی مختصر زندگی میں روایات کو زندہ رکھا اور اپنا خون وطن کی سرحد پر نچھاور کرتے ہوئے ان روایات کو قائم رکھنے کا پیغام ایک انوکھے انداز میں دے گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

نبی آخرالزمان ﷺ نے آخری حج کے موقع پر انسانوں کی رہنمائی کے لئے جو عالمگیر پیغام دیا اس نے ذات پات کی اُونچ نیچ کو نہ صرف مٹا دیا بلکہ انسانیت کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کا ایک ایسا سبق دیا جس میں اخوت ومحبت اور انسانی ہمدردی کے سوا کچھ ہے تو وہ صرف تزکیہ ومجاہدہ، ریاضت اور عبادت الٰہی ہے جس سے انسان اپنے پیدائشی مقصد کو پا کر عرفان الٰہی حاصل کرسکتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا! اے لوگو یاد رکھو تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عربی کو عجمی اور گورے کو کالے پر فوقیت حاصل نہیں۔ فوقیت کا معیار تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔ آپ ﷺ کا یہ پیغام تمام انسانوں کے لئے قیام قیامت تک بڑھائی اور فوقیت کا ایک ایسا معیار مقرر کر گیا جس پر پورا اترنے کے لئے سبھی کو ایک ہی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کا حصول آپ ﷺ کے پیغام اور تعلیمات قرآنی کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی خاندان یا قبیلے کی تاریخ کا بیان محض ظاہری نمود ونمائش یا مادی عروج کی تشہیر ہو تو ایسا بیان نہ صرف بے مقصد ہوگا بلکہ ایسا بیان تاریخ کی توہین کے مترادف بھی سمجھا جائے گا۔ میراثیوں اور ڈوموں کے مرتب کئے ہوئے شجرے، من گھڑت تاریخی واقعات اور پھر ان واقعات کی تشہیر برصغیر پاک وہند کے بعض قبیلوں، برادریوں اور خاندانوں کے لئے جگ ہنسائی کا باعث بنی۔ غیر مسلم تاریخ دانوں اور محققین کو ہمیشہ یہ اعتراض رہا ہے کہ مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن اور مملکت تو مانتے ہیں مگر وہ اس مٹی سے اپنا رشتہ نہیں جوڑتے۔ ہر گوت، ذات، قبیلے، برادری اور فرد کو قریشی، ہاشمی، تیموری، افغان اور ترک کہلانے پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری کے تحت کسی کو عرب، ایران، ترکی اور افغانستان وغیرہ کے کسی قبیلے سے تعلق جوڑنے کا وسیلہ نہ ملے تو اس کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اسے کسی نہ کسی راجہ مہاراجہ یا پھر حکمران خاندان سے جوڑ دیا جائے۔ سرلیپل گریفن کی کتاب لارڈز آف پنجاب ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہے جس میں مسلمان خاندانوں کے من گھڑت شجروں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ برصغیر میں بہت سے سیّد، پیر، صاحبزادے، خانزادے، چوہدری اور جاگیردار انگریزوں نے خود بھی پیدا کئے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہیں مادی قوت سے بھی

آراستہ کیا۔سرلیپل گریفن کی کتاب کے صفحات کئی دلچسپ واقعات سے مزین ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر مسلمان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا شجرہ کسی نہ کسی پیغمبر سے ملائے۔بعض شجرے تو حضرت نوحؑ اور حضرت آدمؑ پر ہی جا رکھتے ہیں۔ چوہدری علی محمد کی کتاب راجپوت گوتیں میں جو تحقیق کی گئی ہے اس کے مطابق بعض لوگوں نے فوجی ملازمتیں اختیار کرنے کے لئے اپنے آپ کو دوسری اقوام میں شامل کرلیا۔ بہت سے راجپوتوں نے پٹھان اور قریشی لکھنا شروع کیا چونکہ مغربی پنجاب میں راجپوتوں کی آبادی کم تھی۔ مولانا محمد علی رسالہ القریش میں لکھتے ہیں کہ محض زمین کے حصول کی خاطر پشاور کے گردونواح کے قریشی اصحاب نے اپنی ذات بدل لی۔ کشمیر میں ڈوگروں نے انتقال اراضی کا ایکٹ جاری کیا تو مالکان زمین کی فہرستیں بننے لگیں اور کچھ مخصوص خاندانوں کو فوجی ملازمتیں بھی ملنے لگیں تو بیشمار لوگوں نے اپنی قومیں پٹواریوں اور میراثیوں کی مدد سے بدل لیں۔ تاریخ شاہان گجر کے مصنف ابوالبرکات مولانا عبدالمالک نے اس سلسلہ میں جو تحقیق کی اس میں کئی دلچسپ باب پڑھنے کو ملتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ پشاور میں پنجو شاہ کا مزار زیارت گاہ ہر خاص و عام ہے۔ پنجو صاحب کی ذات گجر تھی مگر انہیں سیّد بنا دیا گیا اور ان کا ایک شجرہ بھی ترتیب دیا گیا جسے سبھی سچ مانتے ہیں۔ تحقیقات چشتی کے مطابق لاہور کا ایک شخص بھاگو شاہ کرنل بابورائے کا اردلی تھا جس کے چوری کے جرم میں رنجیت سنگھ حاکم پنجاب نے ہاتھ کٹوا دیئے۔ ہاتھ کٹ جانے کے بعد یہ شخص بھیک مانگتا اور لوگ اسے نمانے شاہ کہتے۔ اس کی موت کے بعد کچھ لوگوں نے اس کا شجرہ ترتیب دیا اور اس کی لڑی سلسلہ نوشائیہ سادات سے ملا کر اسے ولّی اکمل قرار دے دیا۔ تاریخ اقوام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شجرے کبھی مکمل نہیں ہوتے خاص کر میراثیوں کے شجروں میں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک میں علم کی کمی کے باعث پٹواریوں اور محکمہ مال نے ان ہی میراثیوں کے بنائے ہوئے شجروں پر اکتفا کیا اور لوگوں کی قومیں اور ذاتیں لکھتے رہے۔ شجرے بدلنے اور من پسند کی قومیں اور ذاتیں لکھنے کا فضول خبط اکثر نو دولتیوں کا بھی مشغلہ رہا ہے جو تا حال جاری ہے۔

علم القیاس کا تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ نگارستان کشمیر کے مطابق اگر قیاس کو تاریخ سے علیحدہ کر دیا جائے تو تاریخ کی مٹھاس کم ہو جاتی ہے مگر مبالغہ آرائی اسے کڑوہ اور بدذائقہ بنا دیتی ہے۔ قیاس صرف گمشدہ کڑی کو ملاتا ہے جبکہ مبالغہ اور جھوٹ سچ کی حقیقت کو بھی کم کر دیتا ہے۔ تاریخ راجگان کشمیر کا مصنف قیاس کو ممکنات سے قریب تر قرار دیتا ہے۔ قیاس کا ذریعہ قبریں، کتبے، کھنڈرات، تحریریں،

زیورات اور نوادرات ہیں۔اس طرح قیاس کی بھی ایک ممکنہ حد ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں۔ ہمارے ہاں شجروں میں تجاوز اس حد تک ہے کہ لوگ حضرت نوحؑ اور حضرت آدمؑ سے شجرہ ملا دیتے ہیں۔

حسب ونسب بدلنے والوں کی تین اقسام کا ذکر مشہور کشمیری محقق اور مورخ جناب محمد دین فوق نے ''تاریخ اقوام پونچھ'' میں کیا ہے اس تحریر کے مطابق اوّل وہ لوگ ہیں جن کی ذات یا گوت تو جنجوعہ، نارو، چب، جاٹ اور راٹھور تھی مگر بوجہ ان لوگوں نے لوہار، ترکھان، صنعت کار، درزی، نائی کا پیشہ اختیار کیا تو ان کی ذات اور گوت بھی یہی لکھ دی گئی۔ وقت گزرتے گزرتے یہ لوگ جب آسودہ حال ہوئے اور کم علمی کے باعث انہیں پچھلی ذات یا گوت کا پتہ نہ چل سکا تو یہ لوگ مغل آرائیں اور چوہدری بن گئے۔مغل اور چوہدری کہلانا اس لئے آسان ہوا کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد اکثر مغل گھرانوں نے انگریزوں کے خوف کی وجہ سے ایسے پیشے اختیار کئے جنہیں انگریز زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے یا جن سے انہیں کسی قسم کا فوجی یا سیاسی خوف نہیں تھا۔ چوہدری ایک وسیع اصطلاح ہے۔ جاٹ، گجر، آرائیں اور بعض راجپورت گھرانے بھی چوہدری کہلاتے ہیں جبکہ پنجاب کے اکثر بڑے زمیندار گھرانے بھی چوہدری کا لقب اختیار کئے ہوئے ہیں۔ چوہدری ایک لقب ہے جو بڑے زمینداروں کے لئے مخصوص تھا مگر وقت گزرتے یہ لقب سے گوت پھر ذات اور آج کل برادری بن گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ آسودگی کے بعد اپنی اصل ذات کی طرف رجوع کریں تو ان پر طرح طرح کے الزامات آتے ہیں اور ان کی بیٹیوں اور بیٹوں کے رشتے بھی نہیں ہوتے۔ چونکہ ان کے پاس ایسے دلائل نہیں ہوتے جس کی بنأ پر وہ اپنی اصل ذات ثابت کر سکیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو بوجہ پیری مریدی اور ارادتمندی کے سیّد قریشی یا ہاشمی بن گئے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ولی اللہ صرف سیّد یا اعوان ہی ہو سکتا ہے حالانکہ یہ خیال علم طریقت نہ رکھنے والوں کا ہے جو ناسوتی کرشموں کو فقر وولائت کی انتہا سمجھتے ہیں۔حقیقت کیا ہے۔اس سے بہت سے عالم اور محقق بھی نابلد ہیں۔علم حقیقت ظاہری اور مادی علوم حاصل کرنے سے نہیں ملتا اس کا تعلق تزکیہ نفس اور مجاہدہ سے ہے مگر ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کا علم اور مشاہدہ اسرار الٰہی بھی ضروری ہے۔علم حقیقت کسی قوم کی میراث نہیں اور نہ ہی یہ نسل درنسل چلتا ہے۔ یہ علم ہر انسان کا بنیادی حق ہے بشرطیکہ وہ اسے اصول طریقت کے مطابق حاصل کرے۔

فقر وولائت کو سیّدوں، ہاشمیوں، قریشیوں اور اعوانوں سے منسوب کرنے والوں نے بلا تحقیق بعض فقرأ کو ان کے وصال کے بعد سیّد کہنا شروع کیا اور ان کے شجرے ترتیب دے کر لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ اسی طرح فقرأ کے آستانوں اور درباروں سے منسلک مجاوروں نے اپنے شجرے ان فقرأ سے ملا کر انہیں اپنا جدامجد ظاہر کیا اور ان مزاروں کے وسیلے سے حکمرانوں سے بڑی بڑی جاگیریں اور عہدے حاصل کئے اور اس کے صلے میں صاحب زادگان نے مریدوں کو حکمرانوں کی اطاعت پر مجبور کیا اور ان کا ووٹ بینک بڑھایا۔

تیسری قسم ایسے نو دولتیوں کی ہے جنہیں کسی لوٹ مار کی وجہ سے وافر دولت بغیر محنت و مشقت کے مل جائے تو وہ بھی اپنی ذات اور برادری پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بڑے صنعتی شہروں میں جا کر وہاں کے دولت مندوں سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور پھر ان ذاتوں برادریوں میں رشتوں ناطوں سے اعلیٰ النسب گھرانا بنا کر ایک ایسا شجرہ ترتیب دیتے ہیں جو کسی ولی، پیغمبر یا پھر راجہ مہاراجہ سے ضرور ملتا ہے۔ شجروں اور نسلوں کی تبدیلیوں کی یلغار پاکستان بنتے ہی شروع ہوئی جو تا حال جاری ہے۔ ہجرت کے وقت لاکھوں لوگ جعلی پرمٹ بنوانے لگے تو محض دو گواہوں کی نشاندہی پر انہیں جاگیر دار، دوکاندار، کارخانہ دار، نمبردار، پیر، وڈیرا، ملک، راجہ، چوہدری، رانا، رئیس، خان وغیرہ قرار دیکر انہیں وسیع جائیدادیں آلاٹ کر دی گئیں۔ ان نو دولتیوں کے گھرانوں نے راتوں رات ترقی کی اور لوٹ مار کے مال کو مزید بڑھانے کیلئے نوکر شاہی کو مختلف طریقوں سے قبضے میں لیا۔ جب ان کے عزیز رشتہ دار ہر محکمہ میں تعینات ہو گئے تو ان کی اتھارٹی کو چیلنج کرنا مشکل ہو گیا۔

نو دولتیوں کی بھی تین واضح اقسام ہیں اوّل وہ لوگ ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے دور ان لوٹ مار کی اور مال دولت اکٹھا کیا۔ بعد میں یہ لوگ ملکی صنعت و سیاست پر چھا گئے اور اپنی قماش کی ایک پوری نسل پیدا کر لی جس نے پاکستان کی حقیقی سیاسی اور جمہوری روایات کو پنپنے ہی نہیں دیا۔ ان لوگوں نے پاکستان کی صنعتی ترقی کو اپنے تک ہی محدود رکھا اور دولت کی تقسیم روک کر قوم کو پسماندگی اور جاہلیت کے اندھیروں کی طرف دھکیل دیا۔ دوسری قسم ان نوکری پیشہ افراد کی ہے جنہوں نے اپنے عہدوں اور رتبوں سے فائدہ اٹھا کر ملکی دولت کو لوٹا۔ جو رقوم قومی ترقی اور عوامی فلاح پر خرچ ہونی چاہیئے تھی اسے ذاتی مصرف میں لے آئے یا پھر بیرون ملک منتقل کر کے ساری قوم کو ورلڈ بنک اور آئی ایم

ایف کی رہن رکھ دیا۔

تیسری قسم سمگلروں اور کرپٹ عناصر کی ہے جنہوں نے نشہ آور اشیأ اور مہلک ہتھیاروں کی سمگلنگ اور کرپشن سے پیسہ بنایا۔ان تینوں طبقات کا اثر ملکی سیاست پر پڑا۔ یہ لوگ اسمبلیاں، عدالتیں اور کچہریاں خریدنے لگے تو عام آدمی بے بس ہو کر ان کا محکوم ہو گیا۔قانون کا احترام ختم ہوا۔ برادری ازم اور قبائلی سیاست کو فروغ ملا جس سے ادارے کمزور ہو گئے اور عام آدمی کا قانون کی حکمرانی اور عدالتوں پر اعتماد ختم ہوا۔یوں ملک ایک ایسی افراتفری کا شکار ہوا جسے سنبھالنا اب کسی کے بس کا روگ نہیں۔

قبیلے، برادریاں، ذاتیں اور گوتیں یادرکھنے اور جاننے کا مقصد اچھی روایات کو برقرار رکھنا ہے نہ کہ ایک دائرے میں مقید ہوکر تعصب اور برائی کو فروغ دینا ہے۔ قبیلے، برادریاں اور ذاتیں پیشوں سے منسلک نہیں اور نہ ہی کسی خاص قبیلے پر لازم ہے کہ وہ کوئی مخصوص علم یا ہنر نہ سیکھے۔ کسی قبیلے یا فرد پر یہ قید بھی نہیں لگائی جاسکتی کہ وہ دینی علوم نہ سیکھے۔ مسلم معاشرے میں عدل ومساوات کی بھی ہوئی حد نہیں اور نہ ہی دین اسلام انسان کی ترقی اور عروج پر کوئی حد لگاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج پاکستانی مسلم معاشرے پر ہندوانہ رسم و رواج کا اتنا ہی اثر ہے جتنا سرحد پار بھارتی معاشرے پر۔ بڑے زمینداروں اور نو دولتیے سیاست دانوں کی ہمیشہ سے کوشش ہے کہ وہ معیاری تعلیم، ترقی، خوشحالی اور سیاسی تدبر وبصیرت کے دروازے عام آدمی کے لئے بند رکھیں تا کہ ذاتوں اور برادریوں میں منقسم عوام ان کے تابع فرمان نفرتوں کی زنجیروں میں بندھے ان کے اشاروں پر ناچتے رہیں۔ بدقسمتی سے ہندو معاشرے کی یہ لعنت جو انسانوں کو ذاتوں کے حوالے سے پہچانتی ہے اور جہاں نچلی ذات کے لوگوں کے لئے مندروں، درسگاہوں اور دیگر علوم کے دروزے ہی بند نہیں بلکہ وہ اونچی ذات کے ہندوؤں سے رشتہ داریاں بھی قائم نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے میں ظاہری اور باطنی علوم کسی خاص خاندان کے لئے مخصوص نہیں اور نہ ہی اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی شہادت موجود ہے۔ انسان جس قدر اِن دائروں کا قیدی اور جزیروں کا راجہ بنے گا وہ ملکی اور قومی دھارے سے دور تعصب اور جاہلیت کا شکار ہوتا جائے گا۔ تقسیم سے قبل ہندوؤں نے مختلف تنظیموں کے ذریعے برھمن ذاتوں کو رشتہ داریوں کے ذریعے باہم جوڑنا شروع کیا تا کہ ایک عظیم ہندوقوم کا تصور حقیقت بن جائے۔ اس کھٹن کام کے لئے ان تنظیموں نے خطیر رقوم چندہ جمع کر کے اکٹھی کی اور ہر ذات اور برادری کے لڑکے لڑکیوں کو مذہب، تاریخ، فلسفہ آرٹ وکلچر سائنس اور سیاست کی تعلیم سے آراستہ کیا اور مختلف ریاستوں میں آباد اِن نوجوانوں کی باہم شادیاں کروا کر انہیں رشتہ داریوں کی مضبوط زنجیر میں باندھ دیا۔ تقسیم کے بعد سوشل سیکٹر میں حکومت کی ایما پر یہ سلسلہ جاری رہا اور تین لاکھ سے زیادہ گوتوں، ذاتوں اور برادریوں

کو جو کہ ۲۵ ریاستوں میں آباد ۲۵ ۷ زبانیں بولتی ہیں کو ایک مضبوط ہندو قوم میں بدل دیا جس کی وجہ سے دنیا کی دوسری بڑی آبادی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ گو کہ اس جمہوریت میں بھی کئی قسم کی قباحتیں ہیں مگر دنیا کو دکھلانے کے لئے ان کے پاس ایک ایسا سٹرکچر موجود ہے جس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھرا اور مسلمان بحیثیت قوم دنیا کے سامنے آئے تو اسے قدرت کا عطیہ اور روحانیت کا کرشمہ قرار دیا گیا۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ اس بات کی دلیل تھا کہ پاکستان ایک اسلامک ویلفیئر سٹیٹ ہوگی جہاں جدید سوشل ریفارمز کو اسلامی ڈھانچے میں بدل کر عدل و مساوات کا ایک نادر نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ہر شخص کو احترام آدمیت کے معیار پر پرکھا جائے گا، تعلیم عام ہوگی اور صحت وصفائی کے اسلامی اصولوں کو اپنایا جائے گا۔ عدل وانصاف ایک آزاد اسلامی معاشرے اور ماحول میں میسر ہوگا تاکہ مسلمانان پاکستان ایک آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ایک رول ماڈل بن کر اُبھریں مگر بدقسمتی سے اس قوم کو بانی پاکستان کے بعد کوئی ایسا قائد یا لیڈر نہ ملا جو تحریک پاکستان کے اصولوں پر گامزن ہو کر مسلم قومیت اور ملکی وحدت کے اصول پر چلتا اور ملک کو ترقی کی راہ پر ڈالتا۔ قائداعظم کے بعد حسین شہید سہروردی ایک ایسے لیڈر تھے جنہیں ملکی وحدت اور قومی اتحاد کی علامت سمجھا جا رہا تھا مگر بے اصول سیاست دانوں اور کم ظرف نوکر شاہی کو اس قائد کی مسلمہ قیادت قبول نہ تھی۔

وڈیروں، جاگیرداروں، کارخانہ داروں اور نودولتیوں نے نوکر شاہی کی مدد سے برادری، علاقہ، قوم، قبیلہ اور فرقہ واریت کی سیاست کو اپنایا تو مشرقی پاکستان میں تعصب اور محرومی کی وبأ پھیل گئی۔ بجھائے اس کے کہ کوئی عقلمند اس فتنہ کی طرف غور کرتا اور چنگاری کو جنگل کی آگ نہ بننے دیتا کہ کم عقلوں نے ذاتی اور گروہی مفادات کی خاطر جلتی پر تیل چھڑکا تو اربوں روپے کی جائیدادیں جل کر خاکستر ہوگئیں اور لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ فوج نے ہتھیار ڈالے اور دنیا کے سامنے قوم کی تذلیل ہوئی اور ملک کا ایک حصہ جدا ہو کر مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بن گیا۔ عقل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہنگامی بنیادوں پر سوشل ریفارمز ہوتیں، عدلیہ اور انتظامیہ کے اصول اور ضابطے بنتے۔ قوانین پر سختی سے عمل درآمد کو یقینی بنایا جاتا۔ ہر سطح پر احتساب کا کڑا نظام رائج کیا جاتا تعلیم عام ہوتی اور لوگ برادریوں اور قبیلوں کی سطح سے بلند ہو کر ملکی اور قومی سوچ اپناتے۔ اس طرح گروہی سیاست کا

خاتمہ ہوتا اور قومی سیاست اور وقار کے اصول مرتب ہوتے۔نسل، زبان، علاقہ، برادری، گوت اور ذات کا فرق مٹ جاتا۔تعمیری سوچ جنم لیتی اور تخریبی ذہنیت کو فروغ نہ ملتا۔عوام میں محکومی اور محرومی کے بجھائے جرأت اور خودداری کا حوصلہ پروان چڑھتا۔تعلیم یافتہ طبقہ باہم رشتوں اور ناطوں میں منسلک ہو کر اونچ نیچ کا فرق خود ہی مٹا دیتا جس طرح بھارت میں سوشل ریفارمز کمیٹیوں نے ایک عالمگیر ہندوقومیت کا تصور پیش کیا۔

پختون، بلوچ، پنجابی، سرائیکی، کشمیری، سندھی اور بنگالی رشتوں سے ایک مضبوط پاکستانی مسلمان قوم پروان چڑھتی جونفرت وحقارت کے جذبات کو محبت اور اخوت کے ساتھ ساتھ خاندانی اور خونی رشتوں میں بدل کر قومی وقار اور ملکی یکجہتی کا باعث بنتی۔اس عالمگیر سوچ کے لئے کسی جرأتمند قائد اور مصلح کی ضرورت تھی مگر قوم کی بدقسمتی کہ ہمیں آج تک جو بھی قائد ملے ان کی دوعملی اور دوغلی سوچ نے ملکی نظام کو بے ترتیب کرنے کا ہی راستہ اپنایا۔وہ قوم کے سامنے جو کچھ کہتے ہیں خود ان کا ذاتی عمل ویسا نہیں ہوتا۔ وہ سادگی کا درس دیتے ہیں اور خود عیش کرتے ہیں وہ تعلیم کی بات کرتے ہیں اور اپنا فعل جاہلانہ ہوتا ہے وہ سچ کی تلقین کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے تھکتے نہیں وہ احتساب کا نعرہ لگاتے ہیں اور کرپشن کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔جس قوم کو اس طرح کے قائد اور رہنما ملیں وہ قوم نصف صدی تک قائم اور زندہ رہے یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

ہمارے سیاستدان برادریوں، قبیلوں، ذاتوں، گوتوں کی سیاست کرتے ہیں اور اسی نعرے کے سہارے قومی اور صوبائی سیاست میں اپنا مقام بنائے ہوئے ہیں۔کسی بھی سیاستدان کو ملکی سطح پر پذیرائی حاصل نہیں اور نہ ہی انہیں کوئی اپنا قائد تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ جہاں کہیں ان لوگوں کی پذیرائی ہے وہ مقامی لیڈروں کی مرہون منت ہے جو برادری اور قبیلے کی سیاست اور دولت کے سہارے زندہ ہیں۔آج ہمیں ایٹمی قوت، مضبوط فوج، بہترین خارجہ وداخلہ پالیسی سے بڑھ کر تعلیم کی ضرورت ہے۔ جب تک تعلیم عام نہیں ہوتی اور عدل وانصاف کا معیار نہیں بنتا، تنزلی ہمارا مقدر رہے گی۔ضروری ہے کہ اس بدقسمت قوم پر مسلط حکمران اس طرف توجہ دیں اور ہنگامی بنیادوں پر سوشل ریفارمز اور تعلیم کا نفاذ کیا جائے۔ورنہ وقت کا پہیہ جس رفتار سے گھوم رہا ہے اس سے ہماری سوچ کی رفتار کئی گنا کم ہے۔اگر وقت اور سوچ میں ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی تو ہمارے سست رو اور خود فہمی میں مبتلا قائدین نہ صرف قومی مجرم ہونگے

بلکہ ان لاکھوں شہیدوں کے خون سے غداری کے مرتکب بھی ہونگے جنہوں نے وطن کی شان اور قوم کی آن کی خاطر اپنی جوانیاں لٹادیں اور راہِ حق میں گردنیں کٹوائیں۔

ہماری ساٹھ سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کے باہم ربط اور خونی رشتوں اور جذبوں کے فقدان نے ہمیں رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ تیس سال بعد قوم کے سامنے لانا اور کسی مجرم کو نہ پکڑنا اس بات کی غماز ہے کہ ہم برادریوں کی سیاست اور علاقائی سوچ کے دائرہ سے نہیں نکلے۔ اگر جاپان اور جرمنی پچپن سال بعد اپنے جنگی جرائم تسلیم کر سکتے ہیں اور جنگی قیدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا معاوضہ دے سکتے ہیں تو ہم اپنی ہی قوم پر روا رکھے مظالم اور استحصال پر آنکھیں کیوں بند کر لیتے ہیں۔ اس کا جواب ہمارے کسی مفکر، مدبر، محقق اور قائد کے پاس نہیں۔ ہماری تحقیق سطحی اور من گھڑت مفروضوں پر مبنی ہے۔ جس میں سوائے خود فریبی کے اور کچھ بھی نہیں۔ ہماری فکر کا دائرہ پلاٹ، پجارو، فارن کرنسی اکاؤنٹ، بیرونی دوروں اور ذاتی نمود ونمائش کی حد تک محدود ہے۔ صاحب فکر وذوق کو یہاں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور نہ ہی اس کی سوچ وعمل کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ قانون بنانے والے خود ہی کرپشن اور لاقانونیت میں ملوث ہوتے ہیں۔ قانون کا احترام کرنے والے کو بزدل اور توڑنے والے کو جرأت مند اور جیالا سمجھا جاتا ہے جبکہ قانون کا نفاذ کرنے والے قانون توڑنے کے طریقے بھی بتلاتے ہیں۔ ایک فون کال پر مظلوم کو ظالم اور مجرم بنا کر تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے اور مجرم کو باعزت بری کر کے قانون کا وارث اور وزارت کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔ جس معاشرے اور ریاست میں قانون کو ظالمانہ ہتھکنڈوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو وہاں خوشحالی اور امن کا قیام ناممکن ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ملک میں مساویانہ سوشل ریفارمز نہ ہونے کی وجہ سے ہم ایک دگردوں ماحول میں جی رہے ہیں۔

موجودہ حالات میں ضروری ہے کہ تعلیم اور انصاف کو ترجیح دی جائے اور سوشل ریفارمز کا نفاذ ہنگامی بنیادوں پر ہو۔ ورنہ ترقی اور حقیقی خوشحالی کبھی بھی ہمارا مقدر نہیں بنے گی۔

حسب ونسب بدلنے والوں اور اپنی اصلی ذات برادری اور قبیلہ چھپا کر اپنے خون میں اوروں کا خون ملا کر ناخلف بننے والوں کو دین اسلام میں ناپسند کیا گیا ہے۔ حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے کی اولاد بنے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ دادوں سے نہ پھرو۔ پس جو کوئی اپنے باپ دادوں سے پھرا اس نے کفر کیا۔ پھر فرمایا جو اپنی نسب کو کسی غیر سے منسوب کرے اس پر لعنت ہے۔

تاریخ اقوام پونچھ کے صفحہ آٹھ پر مصنف لکھتا ہے کہ تاریخ آل ذورعین کے مصنف مولانا محمد ابراہیم محشر انبالوی قابل صد تحسین ہیں جنہوں نے اپنی تاریخ اور تحقیق کو خود ہی غلط تسلیم کر لیا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ ہم نے آرائیں قوم کی جو تاریخ لکھی وہ جدید تحقیق سے پتہ چلا کہ ہم اپنی تحقیق میں غلط تھے اور سچے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

قارئین کرام! میری یہ تحریر بھی ذاتی تحقیق ومشاہدہ کے ساتھ ساتھ پرانے قلمی نسخوں کتابوں اور رسالوں کا نچوڑ ہے۔ اس سلسلے میں میں نے جینٹیک ریسرچ وتحقیق سے بھی کچھ مواد اکٹھا کیا ہے جسے آپ کی نذر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس تحقیق کا مقصد اچھی روایات کو آگے بڑھانا ہے نہ کہ کسی کی دل شکنی کرنا۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میری یہ تحقیق غلطیوں سے لبریز ہے جن کی درستگی اہل علم کا فرض ہے تاکہ میری اصلاح ورہنمائی ہو سکے۔

افراد سے معاشرہ، معاشرے سے قبیلہ، قبیلوں سے برادریاں اور برادریوں سے ایک قوم بنتی ہے جسے ہم وسیع تر معنوں میں لیں تو ایک ہی دین و مذہب کے ماننے والے بے شمار قبائل اور برادریاں جو کسی ایک ملک کی جغرافیائی حدود میں رہتی ہوں، جن کی مشترکہ روایات، عادات وخصلیات ہوں، ان کی ایک مشترکہ حکومت، آئین، قانون، اسمبلی، کرنسی، فوج اور انتظامی ڈھانچہ ہو وہ بھی ایک قوم ہی کہلاتے ہیں۔ اسلام نے قومیت کا جو تصور دیا ہے اس سے مراد دین حق کے ماننے والے بھی ایک قوم ہیں جو ایک اُمت کہلاتے ہیں۔ یہ تصور انسانی معاشی معاشرتی اور قدرتی روایات کی عکاسی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو ایک مضبوط روحانی رشتے اور برادری سے منسلک کرتا ہے۔ اسلام نے قومیت کا جو تصور اور قانون دیا ہے اس کے مطابق برتری کا معیار دولت، شہرت یا کوئی ظاہری مادی عہدہ یا رتبہ نہیں بلکہ برتری کا معیار زُہد وتقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ اسلامی معاشرہ اور ریاست فرد کی آزادی پر قدغن نہیں لگاتا بلکہ اس کی آزادی اور رسم ورواج کا بھی احترام کرتا ہے۔ اسلام صرف فرسودہ رسومات کی نفی کرتا ہے تاکہ انسان اخلاقی حدود سے تجاوز نہ کرے اور معاشرے کا ایک اہم رکن بن کر اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔ قبیلے اور برادریاں اُمت کے وسیع تر معنوں میں کلیدی اور ممتاز حیثیت کی حامل ہوتی ہیں جن کے مضبوط معاشرتی اطوار وخصائل اُمت کی وسعت اور مضبوطی کا باعث بنتے ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر جب ابوسفیانؓ کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو حضرت عباسؓ نے ابوسفیانؓ کو ایک بلند ٹیلے پر کھڑا کر دیا۔ جب اسلامی لشکر مکہ کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عباسؓ نے مختلف قبائل کا نام پکار پکار کر کہا کہ یہ فلاں قبیلہ ہے اور اس کا فلاں سردار ہے اور ان میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں۔ کوئی قبیلہ تیر اندازی کا ماہر تھا تو کسی کے شہسواروں کی دھاک تھی۔ کوئی شمشیر زنی کا ثانی نہیں رکھتا تھا اور کسی کے دلیروں اور جانبازوں کو صرف اگلی صفوں میں لڑنا ہی پسند تھا۔ جوں جوں قبیلے گزرتے گئے ان کی خوبیاں حضرت عباسؓ بیان کرتے رہے اور ابوسفیانؓ بھی لاپرواہی سے کہتے رہے کہ مجھے ان کی پرواہ نہیں۔ آخر میں ایک چھوٹا سا دستہ گزرا تو حضرت عباسؓ نے فرمایا یہ مہاجرین کا دستہ ہے اس میں ہاشمی خاندان کے شہسوار ہیں اور اس دستے کے سردار نبی آخر الزماں ﷺ ہیں۔ حضرت عباسؓ کے اس تعارف پر ابوسفیانؓ دھیمے لہجے

سے بولے، کس میں جرأت ہے جو اس لشکر کا سامنا کرے۔اب دنیا ان ہی سے رہنمائی حاصل کرے گی اور قیامت تک ان ہی کی بادشاہی ہوگی۔اس دستے کا معیار تزکیہ اور مجاہدہ ہے ان کے اوصاف پاکیز گی، اخلاق اور تقویٰ ہیں ان کے سامنے دنیا کی کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی اور نہ ہی ان کا سامنا کر سکتی ہے۔چونکہ کعبے کا ربّ ان کے ساتھ ہے۔

قبیلوں اور برادریوں کے متعلق ایک عمدہ وضاحت سورۃ مریم کی آخری آیات میں کی گئی ہے۔فرمانِ خداوندی ہے کہ تم سے پہلے کئی جھگڑالو برادریاں آئیں مگر انہیں ربّ نے فناہ کر دیا اور آج ان کا نام ونشان بھی نہیں۔قبل اس کے بیان ہوا کہ کچھ ایسے بھی ہیں جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور ان کے دل میں بھی محبت ڈال دیتا ہے۔درحقیقت یہی کردار کسی قبیلے یا برادری کی اصل پہچان ہے کے ان سے لوگ محبت کریں اور وہ لوگوں کی خدمت کریں۔دوسری طرف ان قبیلوں اور برادریوں کی بھی مثال ہے جو دوسروں کے لئے مصیبت کا باعث بنتے ہیں جھگڑا کرتے ہیں اور وقتی اقتدار اور قوت کو اپنی کائنات سمجھ کر ظلم و جبر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایسے ظالم لوگوں کا نام ونشان مٹ جاتا ہے اور ایسی کئی مثالیں دنیا میں موجود ہیں مگر جنہیں عقل وسمجھ نہیں وہ ان مثالوں سے سبق حاصل نہیں کرتے اور نہ ہی عبرت لیتے ہیں۔

آج بھی ہمارے اردگرد کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جو قبیلوں اور برادریوں کے خصائل اور پھر قومی وملکی سطح پر ان کے اثرات کا پتہ دیتی ہیں۔وہ لوگ جو اچھے قبیلوں اور برادریوں سے تعلق رکھتے ہوں ان کے دلوں میں غیرتِ ایمانی ہو وہ سطحی اور ذاتی مفاد کے چنگل میں نہیں پھنستے اور نہ ہی ایسے افراد کی ذات سے ملک اور قوم کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ایسے افراد سے اگر قوم کی تقدیر منسوب ہو تو اس قوم کے عروج کا ستارہ ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ایسے افراد جب قوم کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھالیں تو اس قوم کے سامنے کوئی مادی قوت ٹھہر نہیں سکتی۔وہ قبائل اور افراد جن کا تعلق دینِ اسلام کی حقیقی روح یعنی تزکیہ اور مجاہدہ سے ہو۔ان کے اوصاف سے نہ صرف ان کے قبیلے اور برادریاں فیض یاب ہوتیں ہیں بلکہ قومی سطح پر بھی ایسے لوگوں کے کردار کا اثر ہوتا ہے۔

سورۃ مریم میں ہی ایک واقع کا بیان ہے کہ ایک لوہار کے بھوکے بچے کو کافر نے کہا کہ تم بھوک سے مر رہے ہو اگر میں تمہیں رزق دے دوں تو کیا تم دین سے منکر ہو جاؤ گے۔بھوکے بچے نے

کہا ہرگز نہیں میں کئی بار بھوک سے مر جاؤں اور پھر زندہ ہو جاؤں اور پھر بھی بھوک ہی میرا مقدر ہو تو میں تیرا دیا ہوا رزق نہیں کھاؤ گا بلکہ دین پر قائم رہ کر بھوک سے مرنا پسند کرونگا۔ ہماری قومی تاریخ میں غازی علم دین شہید اور مرید حسین شہید کے ایمان افروز کارنامے ایسی زندہ مثالیں ہیں جنہوں نے قومی وقار اور دینی غیرت کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔ جن قوموں میں غیرت منداور با جرأت افراد اور قبیلے ہوں وہ ہمیشہ قائم اور سرخرو رہتی ہیں بشرطیکہ قوم ان غیرت مندوں کی احسان مند رہے اور ان کی عظمت اور شہادت کے واقعات کو تاریخ سے مٹنے نہ دے تاکہ آنے والی نسلیں ان پر فخر کریں۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ اگر کسی قوم سے اس کا جغرافیہ چھیننا ہے تو پہلے اس کی تاریخ کو مٹا دو۔ اس قول اور حقیقت سے انکار بذات خود ایک قومی جُرم ہے چونکہ تاریخ ہی سے انسان کو اس کے ماضی کا پتہ چلتا ہے اور وہ ان اسباق وحادثات کو سامنے رکھ کر اپنا حال درست کرتا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔

قرآن پاک بنی نوح انسان کی تاریخ ہے جو تخلیق کائنات سے لیکر روز آخرت تک ہر چیز کا درس دیتی ہے۔ قرآنی تاریخ کو سمجھنے اور عمل کرنے میں ہی انسان کی فلاح اور بہتری ہے۔ آج مسلمان بحیثیت قوم قرآن کی تعلیمات اور قرآنی تاریخ کے اسباق سے غافل ہو کر ذلت اور پستی کا شکار ہے چونکہ مادی قوتوں نے اسے پہلے دنیا کی لذت کا مزہ چکھایا اور پھر اسے اس لذت سے دور کر کے اسے اسکا دیوانہ بنا دیا۔ اب وہ دنیا کی لذت کے حصول میں دیوانہ وار کبھی ایک در پر اور کبھی دوسرے پر دستک دیتا ہے مگر کوئی در کھل نہیں رہا۔ دوسری جانب اس پر حد لگا دی گئی ہے کہ وہ قرآنی تعلیمات اور تاریخ سے دور رہے تو کبھی نہ کبھی اسے کسی نہ کسی در سے کچھ مل ہی جائے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان۔ صرف نام کا مسلمان ہے اس پر دنیاوی لذتوں کے دروازے بھی نہیں کھلیں گے اور اپنی تاریخ اور تعلیمات سے دوری اسے ذلت کی مزید گہرائیوں میں دھکیل دے گی۔ جلد یا بدیر اگر ہمیں اپنی اصلیت ہی کیطرف لوٹنا ہے تو کیوں نہ ہم آج ہی اپنی اصلاح کر لیں اور اپنے قومی کردار کو قرآنی تاریخ کے مطابق ڈھال کر نہ صرف اپنی ملت بلکہ ساری دنیا کے لئے باعث برکت اور باعث شفاً بن کر دلوں اور ذہنوں پر لگی بیماریوں کو مٹائیں اور عالم انسانیت کو قرآنی تعلیمات کی لذت سے روشناس کروائیں۔

تاریخ حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ راجپوت قبائل کا اصل وطن راجپوتانہ ہے جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس علاقہ میں ایک خاص قبیلہ یا قبائل عرصہ دراز تک مقیم رہے۔ تاریخی اعتبار سے پنجاب میں راجپوتوں کے داخلے کے تین ادوار بتلائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ قبل از تاریخ ہے جب اس دور کی تاریخ مرتب نہیں ہوسکی یا پھر زمانہ کی دستبرد کا شکار ہو کر ضائع ہوگئی۔ یہ زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کا بتلایا جاتا ہے جب چمبہ اور کوہستان جالندھر کے راجپوت چناب اور باری کے دوآبوں پر حکمران رہے ہیں۔ دوسرا دور پہلے دور سے ڈیڑھ ہزار سال بعد کا تصور ہوتا ہے جب اسی نسل کے راجپوت باہمی اختلافات کی وجہ سے اپنے مرکز سے جدا ہوئے اور بہت سے قبیلے جہلم سے شمال کی سمت آباد ہوئے اور اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ تیسرا زمانہ دسویں اور پندرویں صدی کا ہے جب راجپوت اقوام شکست خوردہ ہو کر پنجاب کے مختلف مقامات کی طرف چل نکلیں اور محفوظ علاقہ جات کو اپنے قبضہ میں لیکر چھوٹی چھوٹی حکمرانیاں قائم کر لیں۔

مختلف تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرزمین کشمیر میں تقریبا دوسو سے زائد راجپوت ذاتیں اور گوتیں آباد ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے بنیادی خصائل کو زندہ رکھا اور سرزمین کشمیر کی ترقی اور دفاع میں بھر پور حصہ لیتے رہے۔ کشمیری راجپوتوں کا ایک خاصہ مٹی سے محبت اور مر مٹنے کا جذبہ بھی ہے جسے دوام بخشنے کے لئے یہ قبیلے ہمیشہ سرفہرست رہے۔ کشمیر کے طول وعرض میں پھیلے راجپوت گھرانوں اور خاندانوں کا ایک اور خاصہ یہ بھی ہے کہ یہ گھرانے اور خاندان مخصوص علاقوں میں آباد ہیں۔ اس خصوصیت کی ایک وجہ یہ بھی بتلائی جاتی ہے کہ مختلف قبائل کے ذمے ایک مخصوص علاقہ کا دفاع ہوتا تھا اور اسی ذمہ داری کو نبھانے کی خاطر یہ لوگ دفاعی حصار قائم کرتے اور مخصوص علاقہ جات کو اپنے قبضہ میں رکھ کر اسے ترقی دیتے۔ ان قبائل کا کام محض جنگ وجدل ہی نہیں تھا بلکہ یہ لوگ محنت کر کے اپنی زمینوں سے غلہ اگاتے اور اپنی ضروریات کا سامان پیدا کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔

نارمہ کی وجہ تسمیہ

نارمہ کی وجہ تسمیہ پر کئی تاریخی اختلافات ہیں۔مختلف روایات اور تاریخی حوالوں اور کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ نارمہ قوم کی قدیم تاریخ موجود تھی اور اس قوم کا وجود زمانہ قدیم سے اس سرزمین پر تھا۔تاریخی اختلافات ہی دراصل تاریخی سچائی کی بنیاد ہوتے ہیں اور کسی قوم کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔نارمہ قوم کا جن تاریخی کتب میں ذکر ہوا ان میں مستند تحریریں تاریخ راجگان جموں وکشمیر، تاریخ راجپوتان پنجاب، شجرہ قوم اعوان، نارمہ رانی کا قصہ، تاریخ پرماریہ پنوار، تاریخ اقوام لدھانہ، تبصرۃ الاعوانیہ از مولانا عبداللہ ابن مولوی جنگ باز سکنہ کفل گڑھ، تاریخ خاندان انبہ رایاں، قصہ راجہ بھوج دیو ماخوذ از راج ترنگنی، تاریخ شاہان گجر، آئین اکبری، شجرہ اقوام کشمیر از راجہ تانوں خان ذیلدار، نارمہ راج اور نوشہرہ اور نوشہرہ کی تسخیر از کیپٹن سریندر کمار نارمہ قابل ذکر ہیں۔مکمل تاریخ کشمیر اور تاریخ اقوام پونچھ کے منصف جناب محمد دین فوق اور راج ترنگنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نارمہ قوم کا بنیادی وطن کشمیر ہی ہے اور یہ قوم مختلف ادوار میں کشمیر ہی کی سرزمین پر ایک حکمران حیثیت سے موجود تھی۔راجہ رنادت اور راجہ بھوج جن کا زمانہ حکمرانی ۴۳۶ء تا ۴۹۷ء اور ۱۰۶۳ء تا ۱۰۸۹ء لکھا گیا ہے۔نارمہ راجپوتوں کے ہی اجداد تھے۔راجہ رنادت جو راجہ بجرادت کا بیٹا تھا۔تاریخ کشمیر کے مطابق بجرادت ایک جری حکمران ہی نہیں بلکہ سخی دل اور خداترس انسان بھی تھا۔اس کا زمانہ حکمرانی دس سال آٹھ ماہ ہے۔اس راجہ نے کشمیر میں عدل وانصاف رعایا پروری اور دادگستری میں خوب شہرت پائی۔اس کے مختصر عہد میں مندر اور درس گائیں قائم ہوئیں اور اشلوکوں پر مبنی علوم کا چرچا عام ہوا۔اس کے عہد میں غلہ اس قدر ارزاں ہوا کہ کشمیر سے باہر غلہ خیرات کے طور پر بھیجا جانے لگا۔

بجرادت کی وفات کا زمانہ ۴۳۶ مطابق ۴۸۲ بکرمی بیان کیا گیا ہے اور یہی سال اور دن اسکے خوبرو شہزادے رنادت کے جلوہ افروز ہونے کا ہے۔رنادت نے اپنے باپ کے اچھے اوصاف کو اپنا کر رعایا پروری کی دھوم مچادی۔اس راجہ کے دور میں امن وامان وآسائش وبہبودی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔یہ راجہ استقلال وسخاوت، تزکیہ وعبادت غرضیکہ ہر وصف انسانی میں یگانہ دہر تھا۔اس کے عہد میں

اوّل اوّل کشمیر میں عظیم الشان شفاخانے سڑکیں، راستے، باولیاں، چشمے اور مسافر خانے بنائے گئے اور عوام کی صحت اور سفر کو محفوظ بنایا گیا۔ اس عظیم راجہ نے بچوں اور بچیوں کو عسکری تعلیم سے آراستہ کر کے نیشنل آرمی کی بنیاد رکھی تا کہ بوقت ضرورت ہر شخص وطن کا دفاع کرے اور ملک محض فوجوں پر انحصار نہ کرے۔ اس کی محبوب رانی کا نام نارمہ بیان کیا گیا ہے جو سیّرت اور صورت کی بھی ملکہ تھی۔ قیاس ہے کہ نارمہ قوم اسی نیک نیت، خوش سیرت، فہم وفراست میں بے عدیل خاوند کی مشیر ملکہ کی اولاد ہے۔

اس ملکہ کے بطن سے راجہ دنیادت پیدا ہوا۔ یہ راجہ نوشیروان عادل کا ہمعصر بتلایا جاتا ہے چونکہ اس دور میں نوشیروان نے ہندوستان پر حملہ کیا اور کشمیر کے کچھ نچلے حصوں پر قابض رہا۔ قدیم تاریخ کے مطابق راجہ رناوت اور ملکہ نارمہ نے تزکیہ اور مجاہدہ کی زندگی کو اپنایا۔ ۴۹۷ء میں راجہ رنادت اپنی ملکہ نارمہ سمیت تارک الدنیا ہو گیا اور جنگلوں میں چھپ گیا۔ بعض روایات میں بیان ہے کہ ملکہ نارمہ اور راجہ غار بومہ زدہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ جب رعایا اور اُمرائے سلطنت کو پتہ چلا تو ایک جم غفیر راجہ کی تلاش میں غار کے دہانے پر پہنچا تو آسمان سے پانی برسنے لگا۔ کئی روز کی بھاری برسات کے بعد برف باری شروع ہوئی اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ کئی ماہ بعد جب برف پگھلی تو دوبارہ راجہ اور ملکہ کی تلاش کی گئی مگر اس غار سے ان کا نام ونشان نہ ملا۔

رنادت کے گوشہ نشین اور پھر غائب ہو جانے کے بعد اس کا بیٹا اور روایات کے مطابق نارمہ قوم کا جدامجد راجہ دنیادت ۴۹۷ء میں تخت کشمیر پر جلوہ افروز ہوا۔ دنیادت بھی اپنی ماں اور باپ کی طرح نیک سیرت اور درویش منش حکمران تھا جس کا عہد ۴۹۷ء سے ۵۴۰ء تک ہے۔ ماں باپ کی گوشہ نشینی کے وقت دنیادت اپنے چچا منگلادت کے ہمراہ معبُد ہندوستان کی زیارت کے سلسلہ میں سفر پر تھا۔ جب وہ کوہستان سوالک میں پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ ایک درویش سو سال سے غار میں بیٹھا عبادت الٰہی میں مشغول ہے۔ اس فقیر کامل جس کا نام گنپت لکھا گیا ہے نے دنیادت کو اپنی مریدی میں لیکر مشغول عبادت کر دیا۔ روایات میں ہے کہ دنیادت نے بارہ سال تک سوائے دودھ کے کوئی غذا استعمال نہیں کی اور آخر فقیر کی یمن وبرکت اور خدا کی عنائت سے قلب کی صفائی پا کر کشمیر کی جانب روانہ ہو گیا۔

وطن پہنچ کر پتہ چلا کہ اس کے ماں باپ دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو کر کہیں گم ہو گئے ہیں اور عوام الناس نے تخت حکمرانی نارمہ رانی کی نیک اولاد کی امانت سمجھ کر اس کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔

کشمیر پہنچ کر دنیادت کوہ سلیمان کی چوٹی پر چڑھ گیا اور آگ کا آلاؤ روشن کر کے پرستش الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ رات کے وقت جب آلاؤ سے آگ کا شعلہ بلند ہوتا تو ایسا لگتا جیسے ایک لمبی دم یا آگ کا شعلہ بلند ہو رہا ہے اس نسبت سے دنیادت کو نارمہ کہا جاتا جس کے معنی آگ والا یا پھر روشنی سے بنایا ہوا ہے۔ یہ لقب اس کی نیک سیرت ماں سے بھی منسوب ہے جس کا نام بھی رانی نارمہ تھا۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ دنیادت حکومت سے کنارہ کش ہو کر غار میں جا بیٹھا تو اعیان ملک نے شہزادے سے تخت نشینی کی التجا کی۔ کئی مہینوں کی التجا اور عوام کے آنسوؤں اور آہوں سے دلبرداشتہ ہو کر دنیادت نے مندرجہ ذیل شرائط پر حکومت سنبھالنے کا عندیہ دیا۔ وہ کشمیر ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا واحد بادشاہ ہے جس نے اپنی شرائط پر حکمرانی کا عہد رعایا برایا، اقاصی ودانی سے لیا کہ اگر وہ دنیادت جو نارمہ رانی اور رنادت کا بیٹا ہے کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں تو وہ ان شرائط پر کاربند رہیں گے۔

- کوئی قطعی جھوٹ نہیں بولے گا اور قتل نہیں کرے گا۔
- ہر ہمت والا کمزور کی مدد کرے گا اور اپنے دستر خوان پر کم از کم دو مسکینوں کو کھانا کھلائے گا۔
- محلے اور قبیلے کا حکمران ہی منصف ہوگا۔ حکمران بننے کے لئے مال و دولت نہیں بلکہ زہد و تقویٰ کی خوبی لازمہ ہوگی۔ قاضی اور حکمران ایک وقت کھانا کھائے گا جس کی رسید بحق سرکار بھجوائی جائے گی۔
- کوئی وعدہ خلافی نہیں کرے گا اور نہ ہی بیگانہ حق کھائے گا۔
- جانور کشی اور گوشت خوری پر پابندی عائد ہوگی۔
- عدل و انصاف سے غفلت برتنے والے عاملوں کے لئے گردن کشی کی سزا رکھی گئی جبکہ چوروں اور لیٹروں کے اعضاً کاٹ کر جنگل میں پھینکنے کا قانون رائج ہوا۔
- شاہی خزانے کے لئے دو مضبوط عمارتیں تعمیر کروائیں اور ان پر قفل لگا کر کئی سوراخ بنا دیئے۔ ایک عمارت کو خزانہ خاص اور دوسری کو خزانہ عام کا نام دیا۔ خزانہ خاص میں سرکاری ٹیکس اور لگان لوگ خود بخود ان سوراخوں سے ڈال جاتے جس سے فوج اور سرکاری ملازمین کو تنخواہیں ملتیں جبکہ دوسرے خزانہ میں لوگ صدقات خیرات اور بادشاہ کے لئے نذرانے ڈالتے۔ ان رقوم کو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا جس کا روزانہ، ماہانہ اور سالانہ حساب

رکھا جاتا اور منادی کر کے دونوں خزانوں کی آمدنی اور خرچ سے عوام کو باخبر رکھا جاتا۔

اس نیک سیّرت اور صاحب فہم وعقل بادشاہ نے گگری بل کے مقام پر ایک معبُد تعمیر کروایا جو اس کا محل اور دولت خانہ بھی تھا۔ جہاں وہ عام آدمیوں کی طرح رہ کر عبادت اور حکومت کرتا۔ اسی کے سامنے مراج اور کامراج کے محاصل کی دو عمارتیں تھیں جنہیں شاہی خزانہ کہا جاتا تھا۔ ان خزانوں پر فوج یا پولیس کا پہرہ بھی نہیں تھا چونکہ دن رات لوگ ان خزانوں کو بھرتے اور ضرورت مند انہیں خالی کرتے رہتے تھے۔ صرف حساب وکتاب کرنے والے منشی اور خزانچی بدلتے رہتے اور عوام کو ان خزانوں سے واقفیت دلاتے۔

راجہ کے کردار، سادگی عدل وانصاف کی دھاک عوام کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ ہر شخص خود احتسابی کرتا اور اپنی پیداوار کا دسواں حصہ فروخت کر کے جو کچھ حاصل ہوتا خود بخود شاہی خزانے میں ڈال آتا۔ یہ راجہ ساری عمر ایک ہی خرقہ پہنے رہا اور کبھی بھی گوشت اور مرغن غذا استعمال نہیں کی۔ اس کے زہد وتقویٰ سے لوگ خائف رہتے اور کبھی بھی بے ایمانی وبدنیتی نہ کرتے۔

دنیادت نے فقیرانہ شان سے ۴۳ سال تک کشمیر پر حکومت کی اور 540ء میں ایک روز حجرہ شاہی سے غائب ہوگیا۔ اس راجہ سے منسوب تاریخ میں کئی داستانیں درج ہیں جن کا تعلق اس کے فقر و تدبر سے ہے۔ بعض لوگ اس کی پیغمبرانہ صلاحیتوں کا بھی اعتراف کرتے ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں اور نہ ہی اس کے متعلق پختہ دلیل دی جاسکتی ہے۔ البتہ تاریخ کی تمام کتابوں سے واضح ہے کہ یہ حکمران خداترس اور عوام دوست تھا جس کا عہد حکمرانی سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہے۔ دنیادت کے بعد اس کا بھائی اور رانی نامہ کا دوسرا بیٹا بکر مادت تخت نشین ہوا اور ۴۲ سال تک کشمیر کا حکمران رہا۔ بکر مادت بھی اپنے ماں باپ اور بھائی کا پرتو تھا۔ بکر مادت کی حکمرانی کا زمانہ 530ء سے 582ء کا ہے اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا بالادت تخت نشین ہوا۔ بالادت ۳۵ سال تک کشمیر کے تخت پر براجمان رہا اور 617ء میں وفات پا گیا۔ بالادت اپنی نسل کا واحد حکمران تھا جس نے ظاہری شان وشوکت سے حکومت کی اور تسخیر ہندوستان کا ارادہ لیکر کشمیر سے نکلا۔ اس مہم میں اس نے بہت سے علاقے فتح کئے اور دریائے شور تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔

بالادت کی موت کے بعد اس خاندان کی حکمرانی کا بھی خاتمہ ہوگیا اور حکومت خاندان کا رکوٹ بنسی کے ہاتھ چلی گئی۔

محمد دین فوق لکھتے ہیں کہ رانی نارمہ کی شادی کے متعلق پنڈت کلہن مصنف راج ترنگنی نے بڑی عجیب وغریب روایات بیان کی ہیں جس میں راجہ رنادت کے پچھلے جنم کا ذکر ہے۔شائد یہی وجہ تھی کہ دوسرے جنم میں وہ ایک درویش منش حکمران بن گیا اور اپنی سابقہ زندگی پر نادم ہوا۔محمد دین فوق اور پنڈت کلہن دونوں ہی عظیم انسان اور عظیم تر مورخ تھے۔ان کے قلمی،فکری،شعوری اور عقائد پر مبنی اختلافات اپنی جگہ صادق ہیں۔دونوں کے ادوار میں صدیوں کے فاصلے حائل ہیں اس لئے ان پر بحث کسی بھی طرح دانشمندی نہیں۔راجہ رنادت کے پچھلے جنم پر بحث سے بہتر ہے کہ اس کی ظاہری زندگی، زہدوتقویٰ،دانشمندی،اعلیٰ ظرفی،بہترین طریق حکمرانی اور رعایا پروری کو داد دی جائے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر ہے کہ نیک اور صالح مردوں کے لئے نیک اور صالح بیویاں ہیں۔قرآن کے اس بیان کے مطابق اور تخلیق کائنات کے قرآنی بیان کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو راجہ رنادت جیسے صاحب فکروعمل کے لئے نارمہ جیسی ملکہ خدائی تحفہ تھی جس نے اس نیک اور پارسا حکمران کی مشاورت کرتے ہوئے اس کے عہد کو چار چاند لگائے۔اسی نیک سیرت خاتون کے بطن سے پیدا ہونے والے دنیادت اور بکرمادت نے بھی ثابت کیا کہ نیک اور پارسا والدین کی اولاد کبھی راہ راست سے نہیں بھٹکتی بشرطیکہ انہیں اپنی تاریخ کا علم ہو اور ان کی تربیت میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔

رانی نارمہ کے متعلق مشہور ہے کہ شہزادگی کے دور ہی میں رنادت عبادت الٰہی میں مشغول رہتا اور صبح سویرے دریا کے کنارے سیر کو نکل جاتا۔ایک صبح کو سیر کی غرض سے دریا کنارے ٹہل رہا تھا کہ اسے ایک لڑکی دریا میں بہتی دکھائی دی۔رنادت لڑکی کو نکال کر محل میں لے آیا جہاں اس کی پرورش شہزادیوں کی طرح ہوئی۔نارمہ کی عقل وذہانت سے متاثر ہو کر رنادت نے اسے شادی کا پیغام دیا اور شادی کے بعد اسے امور سلطنت میں اپنا معاون و مددگار بنالیا۔رنادت کی طرح رانی نارمہ کے کشف و کرامات اور خرق عادات کے کئی قصے مشہور ہوئے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مورخین نے ان کے کمالات و عادات پر اپنی اپنی سوچ کے مطابق بحث کی مگر کوئی بھی تاریخ دان ان کے مثبت رویوں اور عدل وانصاف سے منکر نہیں۔

غرض بیان

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ لفظ نارمہ کی وجہ تسمیہ بتلانے والوں نے کئی حوالوں، روایات اور اصطلاحوں کا ذکر کیا ہے۔ دولمیال ضلع جہلم اور ضلع پونچھ کے اکثر اعوان شجروں میں نارمہ خان نامی شخص کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض شجروں میں ناروخان کو نارمہ خان لکھ کر اسے نارمہ قوم کا جدامجد بتایا گیا ہے۔ اگر ہم ناروخان یا پھر نارمہ خان کو نارمہ قوم کا جداعلیٰ مان لیں تو خود اعوانوں کی تاریخ مسخ ہوتی ہے چونکہ اعوان قوم میں ہندو گوت یا قبیلہ ہو ہی نہیں سکتا جبکہ بیشتر نارمہ قبائل آج بھی ہندو ہیں۔ گوجری تاریخ اور بعض شجروں میں بھی نارمہ قوم کا ذکر ہے جس میں نارموں کو گوجروں کی ایک گوت بتلایا گیا ہے۔ چوہدری اکرام الحق سابق سیکرٹری ورجسٹرار آزاد کشمیر سپریم کورٹ کے مطابق نارموں کے علاوہ سوات کا شاہی خاندان بھی گوجروں ہی کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے پاس کئی تاریخی ثبوت موجود ہیں۔

تاریخ اقوام پونچھ کے مصنف کے مطابق دولمیال کے اعوان دلمی کی اولاد ہیں۔ جس کے نام پر دولمیال آباد ہوا۔ اس کے پوتے ناگ شیر اور بھاگ شیر جو کہ ناروخان کے بیٹے تھے اپنے چچا لگڑ خان کے ہمراہ ہجرت کر کے پونچھ کے علاقہ میں آباد ہو گئے اور اسی نسبت سے نارمہ کہلائے۔ حیرت ہے کہ ناروخان کے بیٹے تو نارمہ ہو گئے جبکہ کشمیر میں آباد اعوان اپنے آپ کو نارمہ نہیں لکھتے چونکہ یہ بات عقل کے مطابق نہیں۔ تبصرۃ الاعوانیہ میں نارموں کو اعوانوں کی ایک شاخ بتلایا گیا ہے۔ مگر فوق اس سے اتفاق نہیں کرتے جس پر وہ حق بجانب ہیں۔ اگر نارموں کو اعوان تصور کر لیا جائے تو خود اعوانوں کا شجرہ بگڑ جائے گا اور ان کا قطب شاہی ہونا شک کا باعث بن جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ پونچھ کے کچھ نارمہ خاندانوں کی اعوانوں سے رشتہ داریاں قائم ہوئی ہوں جس کی بنا پر کسی نے اعوانوں کا شجرہ نارموں سے ملا دیا ہو۔ جس طرح سادات میں سے ہندو شاخ نہیں ہوسکتی اسی طرح اعوان، قریشی اور ہاشمی بھی ہندو نہیں ہوسکتے۔ بعد کے دور میں مغل ہندوستان میں آئے تو وہ مسلمان ہی تھے اس لئے کوئی مغل ہندو نہیں۔ تاریخ کی درستگی کے لئے ضروری ہے کہ پٹواریوں کے شجروں اور من گھڑت کہاوتوں کو بنیاد بنا کر قوموں کی اصل تاریخ کو عقل سے مطابقت نہ رکھنے والے حوالوں سے نہ جوڑا جائے۔ تاریخ کے مطابق

اصل اعوان عون قطب شاہ کی اولاد سے ہیں جو محمد بن الحنیفہ کی اولاد تھے جبکہ نارمہ قوم کا اصل وطن کشمیر ہی ہے اور ان کی کوئی شاخ اعوان نہیں۔ نارموں کی اکثر شاخیں آج بھی ہندو ہیں جن کا مرکزی علاقہ تحصیل نوشہرہ ضلع جموں ہے۔ گو کہ اس قوم کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے نام اسلامی طریقہ پر رکھے گئے اور ان کے دینی عقائد بھی بدل گئے مگر مذہب کی تبدیلی سے ذات نہیں بدل سکتی۔

شاہان گجر کے مصنف لکھتے ہیں کہ پونچھ کی بہت سی اقوام کی طرح نارمہ قوم اپنی تاریخ سے ناواقف ہے اس سلسلہ میں وہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں کے گاؤں فتح پور پلانی کے نارمہ راجپوتوں کی مثال دیتے ہیں کہ انہیں اپنی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں۔ تاریخ شاہان گجر کے مصنف کی یہ دلیل بھی بے وزن ہے چونکہ ضروری نہیں کہ اگر کسی ایک گاؤں میں فارغ البالی ہو اور لوگ تاریخ کے علم میں دلچسپی نہ رکھتے ہوں یا پھر وہاں علم حاصل کرنے کا رواج نہ ہو تو ان کی تاریخ ہی مٹ جاتی ہے۔ بلوچستان کے اگر کسی دور دراز گاؤں کے بلوچوں کو بلوچستان اور ایران کی تاریخ یاد نہیں تو ہم اس بے علمی اور بے فکری کی بنیاد پر انہیں غیر بلوچ تصور نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس پر تنقید میں حق بجانب ہونگے۔ تاریخ راجگان جموں وکشمیر اور تاریخ راجپوتان پنجاب کا مصنف لکھتا ہے کہ نوشہرہ سب ڈویژن جو کہ میر پور ضلع کا حصہ ہے میں کئی راجواڑے خودمختار حیثیت رکھتے تھے۔ ان راناؤں میں سے خاندان نارمہ جو پنواریوں کی ایک شاخ تھی مسلمان ہوگئی۔ نارمہ قوم خاندان اکھنور یہ انبہ رایان پنوار کی ہی شاخ تھی جو مسلمان ہو کر نارمہ مسلمان کہلانے لگی۔ اس مصنف کے مطابق علاقہ نوشہرہ میں پتنی اور کھمباہ کے قلعے نارمہ راجپوتوں کی جاگیر میں تھے۔ جنہیں بعد کے دور میں اکبر اعظم نے مرمت کروایا اور انہیں اپنے مصرف میں لے آیا۔

ٹھاکر کاہن سنگھ کے مطابق راجپوتوں کے دو بنس مشہور ہیں جنہیں سورج بنس اور چندر بنس کہا جاتا ہے۔ تیسرا بنس جو اگنی بنس کے نام سے مشہور ہے وہ بھی ان دو بنسوں سے نکلا ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش سے سوا چھ سو سال پہلے ظہور پذیر ہوا۔

ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق اس بنس کی پیدائش آگ سے ہوئی اور اس کا نام اگنی کل بنس رکھا گیا۔ اس بنس سے کئی شاخیں نکلیں جن کی اولاد سے چوہان اور پرماریا پنوار قبائل کا سلسلہ نسل چلا۔ پرماریا پنواریوں کا پہلا بادشاہ مہاراجہ بکر ماجیت والئی اوجین تھا جبکہ مہاراجہ بھوج کا تعلق بھی پنوار خاندان ہی سے تھا۔ تاریخ راجپوتان پنجاب کے مطابق پرمار خاندان کی بڑی بڑی پینتیس شاخیں لکھی گئی

ہیں۔مصنف کے مطابق ہر شاخ اپنے کسی نہ کسی بزرگ یا پھر خطاب یا گاؤں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس مصنف کے مطابق پرمار خاندان میں مہاراجہ بھوج کی نسل سے نام دیونامی ایک راجہ گزرا جس کے ایک فرزند راجہ جگدیو سے خاندان انبہ رایان نکلا۔ یہ قبیلہ عرصہ تک اکھنور کا حاکم رہا اور خاندان اکھنوریہ بھی کہلایا۔اس خاندان کا ایک بزرگ راجہ بجے پال راجہ رنجیت سنگھ والئی جموں کے زمانہ تک زندہ رہا۔ یہ شخص انتہائی رحمدل اور عبادت گزار تھا۔اس نے صرف انبہ ران کا گاؤں اپنے مصرف میں رکھ کر باقی علاقہ آزاد کر دیا اور لوگوں سے لگان اور دیگر مراعات لینی بند کر دیں۔اس تاریخ کے مطابق نارمہ قوم کا تعلق خاندان اکھنوریہ انبہ رایان سے ہے جن کی حاکمیت اکھنور اور ملحقہ نوشہرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ان کے تعلق ڈوگروں سے بھی تھے مگر یہ کبھی بھی جموں کے حاکم کے ماتحت یا باجگزار نہیں رہے۔

نارمہ کی ایک اور وجہ تسمیہ ضلع کوٹلی کا گاؤں نرماہ بتلایا جاتا ہے کہ یہ قوم اپنے گاؤں نرماہ کی وجہ سے نارمہ کہلائی۔نرماہ کے اردگرد آثار قدیمہ کے بیشمار اثاثے آج بھی موجود ہیں جن کی کھدائی سے یہاں پر بسنے والی اقوام کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلہ میں راقم نے اپنے تہی کچھ کوشش کی تو چند قدیم سکے نرماہ کے کھنڈرات سے ملے جن پر عربی اور ہندی رسم الخط سے ملتے جلتے نشانات بڑے واضح نظر آتے ہیں۔راقم نے یہ سکے پشاور اسلام آباد اور لندن میں مقیم کچھ ماہرین آثار قدیمہ کو دکھلائے مگر تا حال ان پر کسی نے بھی حتمی رائے نہیں دی۔اگر ہم نرماہ ہی کو اس قوم کی وجہ تسمیہ مان لیں تو اس پر بھی موثر اتفاق ممکن نہیں۔نرماہ کے گاؤں میں جو ذیلدار نمبر دار اور سفید پوش گزرے ہیں ان کا تعلق نارمہ خاندان ہی سے تھا مگر کثیر آبادی اپنے آپ کو بھٹی اور جنجوعہ راجپوت ظاہر کرتی ہے جبکہ کچھ گھرانے انصاری اور دت کہلاتے ہیں۔نرماہ کے جنجوعہ راجپوتوں نے جو شجرہ ترتیب دیا ہے اس کے مطابق ان کا جدامجد راجہ نارسنگھ تھا جو کہ دسویں پشت میں راجہ جگدیو کی اولاد سے ہی ملتا ہے۔ یہ شجرہ بھی ایک عجیب ملغوبہ ہے جس کا تعلق جنجوعہ تاریخ سے کسی سمت بھی نہیں ملتا اور نہ ہی تاریخ کی کسی کتاب میں اس علاقہ میں جنجوعہ راجپوتوں کا کوئی سراغ ملتا ہے۔قدیم تاریخ میں مہاراجہ بھوج جس کا زمانہ ۶۳۱ق م ہے کی اولاد میں راجہ جگ دیو ہوا ہے جس کا خاندان انبہ رایان کہلاتا ہے جو کہ اکھنور کے حکمران ہوئے ہیں۔ راج ترنگنی کے مطابق کشمیر کا پہلا حکمران راجہ گوند بھی جموں واکھنور ہی سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اکھنوریہ خاندان کی قدیم تاریخ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

نرماہ کے جنجوعہ راجپوتوں کا سراغ لگانے کے لئے راقم نے تاریخ کی سبھی جانی مانی کتابوں کو کھنگالا مگر کہیں سے بھی کوئی کڑی نرماہ کی سمت نہیں ملتی۔ جنجوعے اپنا تعلق پانڈو کی اولاد سے بتلاتے ہیں جو کہ جنجوعہ کے سب سے بڑے بزرگ راجہ مل کا نکاس تھا۔ لیپل گریفن نے راجہ مل کو راٹھور لکھا ہے جبکہ ایک اور انگریز مصنف تھامس اپنی رپورٹ جہلم میں بھی جنجوعوں کو جودھپور کے راٹھور ہی کہتا ہے۔ ٹھاکر کاہن سنگھ بلاوریہ جس نے ساری زندگی راجپوت گوتوں کو ترتیب دینے اور ان کے صحیح شجرے مرتب کرنے میں گزاری وہ جنجوعوں کو چندر بنسی یادو تو مانتا ہے مگر راٹھور تسلیم نہیں کرتا۔ کچھ تاریخوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ راجہ مل ۹۱۰ء میں جودھپور قنوج سے نقل مکانی کر کے جہلم کے راج گڑھ مقام پر آیا جسے اب ملوٹ کہتے ہیں۔ محمود غزنوی نے جہلم پر حملہ کیا تو جنجوعہ قوم شکست خوردہ ہو کر بکھر گئی۔ اسیری اور قتل کے خوف سے راجہ مل نے دین اسلام قبول کر لیا جس کی تقلید میں دیگر قوم بھی حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ جنجوعہ کا لفظ جنجو یعنی زنار سے نکلا ہے جو راجہ مل اور دیگر ہندو پہنتے تھے۔ جب راجہ مل نے زنار توڑا تو اس کی قوم جنجوعہ کہلانے لگی۔ راجپوت گوتیں کا مصنف اس سے اتفاق نہیں کرتا چونکہ جنجو توڑنے سے قوم کا نام نہیں بدل سکتا۔ اس کے مطابق مل کے ایک بیٹے کا نام جوہد تھا جس کی اولاد جنجوعا کہلاتی ہے۔ برانڈرتھ نے جوہد کے بھائی ویر کی اولاد کو جنجوعا لکھا ہے۔ برانڈرتھ لکھتا ہے کہ جنجو توڑنے والے کو جنجو توڑ لکھنا چاہئے تھا اس لئے زیادہ موزوں بات یہی ہے کہ جوہد یا پھر اس کے بھائی ویر کی اولاد جنجوعا ہو سکتی ہے۔ مل کی اولاد میں اس کے بیٹے جوہد، ویر، کالا، ترلونی اور کھکھا تھے۔ مل کے بعد جوہد کھیوڑہ اور پنڈ دادن خان کا حکمران بنا۔ راجہ احمد خان کی اولاد ملوٹ، بادشاہ پور اور ڈھلوال میں آباد ہوئی جبکہ ویر کی اولاد دکھیالہ میں اور کالا کی راولپنڈی جبکہ ترلونی کی اولاد ہزارہ راولپنڈی اور اٹک میں بسنے لگی۔ کھکھہ کی اولاد مظفر آباد اور پونچھ میں آباد ہوئی جن کی آبادی بہت قلیل ہے۔ جنجوعہ قوم ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کا ساتھ دیتی رہی ۱۳۹۱ء میں جنجوعہ قوم تیمور کے ساتھ تھی اور ۱۵۲۶ء میں جنجوعوں نے بابر کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۷۶۵ء میں مغل حکومت کمزور ہوئی تو جنجوعہ قوم پھر زوال پذیر ہوگئی چونکہ وہ مقامی طور پر گکھڑوں اور اعوانوں کے مقابلے میں کمزور تھے اور گکھڑ ہمیشہ ہی جنجوعہ قوم کی شکست اور

زوال کا باعث رہے۔اسی مجبوری نے جنجوعوں کو بیرونی حملہ آوروں کا محتاج کیئے رکھا۔تاریخ کے حوالے سے جنجوعہ قوم کے لقب راجہ رائے اور ملک ہیں ان میں رانا اور بھٹی کبھی نہیں سمائے۔

کشمیر میں جنجوعہ قوم لسانہ پٹھانہ تیراوڑی مہنڈھر کلاہوتہ کوٹان ملکوٹہ ،نڑول بنولہ سلواہ، بھیرہ، کالا بن، میدان، گورہستانی ناڑ، سورج پوٹھی اور راجوری وغیرہ میں آباد ہیں ۔اس شاخ کے کسی بھی بزرگ کا نرماہ ضلع کوٹلی میں آباد ہونا معلوم نہیں اس لئے نرماہ کی کثیر آبادی کا جنجوعہ کہلانا درست معلوم نہیں ہوتا۔نرماہ کے جنجوعوں نے جو شجرہ ترتیب دیا ہے اس میں کچھ نام نارموں ہی کے ہیں جن پر مورخین بھی متفق ہیں۔اس طریق سے زیادہ قریب یہی قیاس ہے کے نرماہ کی آبادی نارموں ہی کی ہے جنجوعوں کی نہیں۔اس لئے ان کے لئے یہی موزوں رہے گا کہ وہ تاریخ کی ترتیب سے اتفاق کر کے اپنے آپ کو نارمہ ہی لکھیں۔

بھٹی راجپوتوں کا مکمل شجرہ تاریخ راجپوتان پنجاب میں درج ہے کہ اس قوم کا تعلق سری کرشن جی مہاراج سے ہے۔ یہ قوم جیسلمیر ،حصار، بھٹیانہ، جموں ،اور پنجاب کے وسیع علاقوں میں حکمران حیثیت سے رہی اور آج بھی پورے طمطراق سے موجود ہے۔تاریخ کے مطابق شری کرشن جی کی ایک اولاد ہیم سے جاٹ قوم پیدا ہوئی جن کا تذکرہ تاریخ راجپوتان پنجاب میں کیا گیا ہے۔ہیم کی نسل سے جاٹ یا پھر جٹ کہلائے جبکہ دوسری اولادوں سے جو بھٹیانہ میں آباد ہوئیں بھٹی کہلانے لگے۔بھٹی راجپوتوں کا تعلق بھی چندر بنسی خاندان سے ہے جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔کشمیر کے نزدیک ترین علاقوں میں بھٹی قوم جہلم گجرات اور تحصیل گوجر خان میں پائی جاتی ہے جبکہ کشمیر کے پونچھ شہر میں ان کی آبادی پچھلی صدی میں صرف چھ ہزار کے قریب درج ہے۔تحصیل حویلی میں بھی بھٹی خاندان آباد تھے جو سلوتری اور سمبوٹ کے جاگیردار تھے۔کھینتر کے بھٹی راجپوت بھی تاریخی اہمیت رکھتے تھے اور علاقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔بھٹی خاندان کے کچھ لوگ ضلع باغ میں بھی آباد ہیں تاہم نرماہ کے علاقہ میں بھٹی خاندان کا کوئی سراغ تاریخ میں نہیں ملتا۔ یہ تاریخی جائزہ اور قدیم کتب میں درج واقعات جن سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں ان سے واضح دلیلیں ملتی ہیں کہ نارمہ راجپوت کسی خاص جگہ یا مقام کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی ذات ہی سے نسبت رکھتے ہیں اور ان کا نکاس رانی نارمہ ہی سے ہوا ہے جس کی اولاد کا نارمہ کہلانا قیاس اور تصدیق تاریخ کے عین قریب ہے۔نارمہ رانی کی اولاد بھی اپنی ماں

کی طرح فطرتاً نیک اور پارساتھی اور یہ اوصاف چیدہ چیدہ آج بھی اس قوم میں موجود ہیں۔کوئی بھی صاحب ثروت اور صاحب اقتدار نارمہ سنگ دل اور ظالم نہیں بلکہ جن لوگوں کو خدا نے علم، عقل، ہنر اور مال و دولت سے نوازا انہوں نے اس ظاہری اور باطنی قوت کو ہر خاص و عام کیلئے وقف کیا اور رعایا پروری کو ہی اپنا شعار بنایا۔ عاجزی وانکساری کے ساتھ ساتھ روحانیت سے لگاؤ بھی اس قوم کا خاصہ ہے۔ جہاں کئیں علوم ظاہری کی چنگاری پھوٹی وہاں علوم باطنی نے خود ہی مقام بنالیا۔کشمیر کے حکمران رنادت کا زمانہ ۴۳۶ء اور جگدیوں کے ۱۲۳۱ء میں ایک طویل عرصہ حائل ہے جس کی کڑیاں ملانا ایک انتہائی مشکل امر ہے۔تاہم بعض حقیقتیں انہیں علم القیاس کے قریب کر کے باہم جوڑنے میں مدد دیتی ہیں جن میں بڑی سچائی مادی عروج سے فقر کی طرف مائل ہونا اور اپنے خزانے عوام پر کھول دینا اور انسانیت کی خدمت کو شعار بنانا ہے۔جس طرح رانی نامہ اور رنادت دنیا کے خزانوں کو چھوڑ گوشہ نشین ہوئے ویسے ہی ان کا عظیم فرزند اور وقت کا قوی تر بادشاہ دنیادت بھی اپنے معُبد سے اچانک غائب ہو گیا۔ پھر اسی خاندانی روایت کی تقلید اکھنور کے حاکم اور انبہ رایان کے نارمہ سردار راجہ بجے پال نے کی اور صرف اپنی ضرورت کے لئے ایک گاؤں پاس رکھ کر ساری ریاست اور حکمرانی سے دستبردار ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو گیا۔اگر ہم ہندو اصطلاح اور عقیدے کی طرف جائیں تو بھی سچائی کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اگنی بنس یا ناری بنس سے بھی ثابت ہے کہ رانی نارمہ کا درویش صفت شہزادہ دنیادت جب کشمیر آیا تو بجھائے تخت شاہی پر بیٹھنے کے وہ تخت سلیمان پر جا پہنچا اور آگ کا آلاؤ روشن کر کے عبادت وریاضت میں مشغول ہو گیا۔اس آگ کی روشنی کی وجہ سے اسے نار میں نہایا ہوا کا لقب بھی ملا جو اس کے زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری کی علامت تھا۔نارمہ رانی، نار میں نہایا ہوا اور نر ماہ تینوں اصطلاحیں اس بات کی دلیل ہیں کہ نارمہ قوم کا ایک قدیم وجود ہے اور یہ قوم حکمران حیثیت میں دور قدیم سے آباد ہے۔اس کے اجداد اکھنور نوشہرہ باغ اور کشمیر میں آباد رہے ہیں۔ نارمہ قوم کے لقب راجہ، رائے، راؤ، رانا اور خان ہیں۔ نارمہ رانی کے پوتے بالادت جس کا لقب بکر مادت تھا نے ۴۲ سال کشمیر پر حکمرانی کی اور پنجاب کے وسیع علاقے فتح کئے ۔اس کے دور میں نارمہ راجپوت پنجاب، جموں اور دوآبہ کے علاقہ میں بھی آباد ہوئے اور اپنی حکمرانیاں راناؤں کے لقب سے قائم کیں ۔رانا چھوٹے درجے کے حکمران ہوتے تھے جن کے پاس کم علاقہ اور کمزور مادی قوت اور تھوڑی فوج ہوتی تھی ۔رانا ایک قسم کا ذیلدار یا پھر چھوٹا جاگیردار ہوتا

مگراسے اپنی جاگیر میں وسیع اختیار ہوتے اور وہ راجہ یا حکمران کے ماتحت تصور کیا جاتا۔

نرماہ کے جنجوعہ اور بھٹی خاندان نے جس راجہ جگدیو کا ذکر اپنے شجرہ میں کیا ہے اس کا تعلق انبہ رایان کے نارموں سے ہی ہے۔اس نام کے کسی راجہ کا ذکر بھٹی اور جنجوعہ شجرہ میں نہیں اور نہ ہی تاریخ کی کسی کتاب میں جگدیو اور نارسنگھ کا ذکر ملتا ہے۔جگدیو نارمہ کی اولاد سے نارسنگھ کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ نارسنگھ ہی نرماہ میں آباد ہوا اور اپنے اوصاف،معنی،نام اور قوم کی وجہ سے اپنے مقام کا نام نرماہ رکھا ۔اگر جگدیو کی اولاد سے جیسا کہ شجرہ سے ظاہر ہے نارسنگھ کا ہونا تسلیم کر لیا جائے تو نرماہ میں مقیم کثیر آبادی جنجوعہ یا بھٹی نہیں بلکہ نارمہ ہی ہے چونکہ اس کے اردگرد نارمہ قوم کے بیشمار گاؤں آباد ہیں جن کا ذکر تاریخ کی متعدد کتابوں میں آتا ہے۔

تاریخ اقوام پونچھ کے مصنف کے مطابق کھمباہ سب تحصیل نوشہرہ ضلع میر پور میں سردار سنگھ اور اندر سنگھ ذیلدار نارمہ تھے اور کھمباہ کے گردونواح میں نارموں کی کثیر آبادی تقسیم سے پہلے موجود تھی۔ شجرہ تانوں خان ذیلدار کے مطابق نارسنگھ ذیلدار نرماہ سردار سنگھ اور اندر سنگھ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا بلکہ خاندانی تقسیم میں اندر سنگھ کے پڑدادا کے زمانہ میں نارسنگھ کو نرماہ اور پلا ہل (ہر دو) یعنی خورد وکلاں حصہ میں ملے اور وہ نرماہ ہی کا مالک ٹھہرا۔ نارسنگھ اندر سنگھ اور سردار سنگھ کا تعلق بھی انبہ رایاں اور اکھنور یہ خاندان سے تھا اور ان ہی کی لڑی کے راجگان پونچھ علاقہ باغ،ڈوڈا اُوڑی اور بارہ مولا کے نواح میں آباد رہے مگر سوائے باغ میں مقیم نارمہ راجپوتوں کے ڈوڈا اُوڑی اور بارہ مولا کے کسی خاندان کا قبول اسلام تاریخ کے حوالے سے معلوم نہیں۔آج بھی تحصیل نوشہرہ کے نواح اور اکھنور میں ہندو نارمے موجود ہیں اور آسودہ حال زندگی گزار رہے ہیں۔

بالادت حاکم کشمیر نے جب تسخیر ہندوستان کے سلسلہ میں پنجاب کی طرف یلغار کی تو اس دور میں بہت سے رانا پنجاب میں بھی آباد ہوئے جن سے رانا اور نارو راجپوتوں کی نسل چلی جو آج بھی دہلی، حاصل پور ضلع بھاولپور،سیالکوٹ،راولپنڈی اور سائیوال کے اضلاع میں موجود ہیں۔نار بنسی راجپوتوں کی نسل میں نارموں کے قریب ترین یعنی ہندو عقیدہ کے مطابق چوہان راجپوت بتلائے جاتے ہیں اور عہد قدیم میں چوہانوں اور نارموں کی قریبی رشتہ داریاں بھی تھیں ۔ پرتھوی راج چوہان کی افواج میں کمانداریاں اکثر راناؤں یعنی نارموں کو دی جاتی تھیں جو سانڈھوں پر بیٹھ کر حملہ آور ہوتے اور اس طریقہ

جنگ کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے۔ کشمیر کے نارمہ راجپوتوں کی رشتہ داریاں چِپ، جرال، تھکیال، ڈومال جنجوعہ، نارو، منگرال اور سوہلن راجپوتوں کے علاوہ گکھڑوں اور سدھنوں سے بھی قائم ہوئیں جن کا اصل مسکن کشمیر نہیں۔ تاریخ کے اوراق کے مطابق گکھڑ اور سدھن قبائل کا تعلق افغانستان اور ایران سے ہے۔ آج بھی کثیر تعداد میں سدوزائی قبائل افغانستان میں آباد ہیں جبکہ گکھڑ جو کیانی بھی کہلاتے ہیں صوبہ سرحد کے تیرہ، کوہاٹ، پشاور، چارسدہ، جنوبی وزیرستان کے سرحدی علاقوں اور ایران میں آباد ہیں۔ کیانی ایران کے حکمران بھی رہے ہیں جو کسی دور میں ہندوستان آکر جہلم اور پنڈی کے علاوہ کشمیر کے پونچھ جموں اور اُوڑی کے علاقوں میں بھی آباد ہوئے۔ کیانیوں کا کشمیر میں آباد ہونا ایک فطری امر ہے چونکہ یہاں افغانوں نے ایک عرصہ تک حکومت کی جو افغان دور کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے قبل زمانہ میں سلطان شہاب الدین اور سلطان سکندر کے دور حکمرانی میں کشمیر اور وسط ایشیا کے گہرے روابط تھے اور امیر تیمور کشمیری حکمرانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تیمور اور بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو جنجوعہ قوم نے دونوں حملہ آوروں کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے گکھڑ قبائل نقل مکانی کر کے کشمیر میں آباد ہوئے مگر ان کی آبادی زیادہ نہیں۔ تاریخ کی مستند کتابوں کے مطابق نارمہ راجپوت اکھنور، نوشہرہ، کھمبا، کانگڑی بھجوال اور جموں کے علاوہ بھمبر ضلع کے گرون، بڑوہ، مکڑی، بوہانی، تتدڑ، سریاہ، ہری پور، پنجن، پلاہل خورد وکلاں، نرماہ، درکوٹی، ٹائیں، سبز کوٹ، ناڑا کوٹ چڑہوئی، دھمال کے علاوہ ضلع باغ اور راولا کوٹ میں آباد ہیں۔

کتابی حوالوں سے بھمبر، کوٹلی اور باغ کی ممتاز نارمہ شخصیات کا ذکر بھی ہوا ہے جن کے نام راجہ فیض طلب خان سفید پوش و جاگیردار درکوٹی، صوبیدار سیّد محمد خان موضع ٹائیں، صوبیدار سیف علی خان سکنہ بڑوہ چوہدری رحم علی خان ذیلدار بڑوہ محمد خان نمبردار بڑوہ لیفٹیننٹ مظفر خان شہید ستارہ جرأت (دوبار) موضع پنجن راؤ عمر خان سبز کوٹ راجہ امداد علی خان، صوبیدار صلاح محمد خان ناڑا کوٹ، راؤ خلیل خان چڑہوئی، راجہ فیض محمد نمبردار پنجن راجہ سیّد محمد خان نمبردار چڑہوئی، راجہ محبت خان ذیلدار موضع تتدڑ، سفید پوش ذیلدار راجہ ولائت خان نرماہ اور راجہ زمان علی خان آف پلاہل خورد مشہور شخصیات تھیں۔

ضلع باغ کے مشہور نارمہ گاؤں کفل گڑھ، لودر، سارمنڈل بہٹی، چھڑ، پسی دا جھولہ، نکیر، ڈوم

کوٹ، سیری، اوبڑا، دھندھار، چتر اور پدر منقولہ تاریخ اقوام پونچھ ہیں جن کی ترتیب بھی اسی انداز سے بیان ہے۔ اس کے علاوہ چیڑاں گاؤں کا بھی تاریخ میں ذکر ہے یہ گاؤں اور موضع اب پھیل کر بڑے علاقوں میں تبدیل ہو چکے ہیں جبکہ کثیر آبادی نقل مکانی کر کے شہروں اور قصبوں میں چلی گئی ہے۔ تاریخ میں درج ضلع باغ کی اہم شخصیات راجہ مکڑ خان راجہ سہسی خان، راجہ ہیرا خان تھیں جن کی اولادیں باغ کے علاقہ میں پھیلیں اور اہم مقام و نام پیدا کئے۔ ان بزرگوں کی اولاد سے ہی کرنل راجہ نسیم خان وزیر حکومت آزاد کشمیر، راجہ سبیل خان ایم ایل اے و سابق مشیر حکومت آزاد جموں و کشمیر، کرنل راجہ رشید خان کرنل راجہ ضمیر خان جناب عبدالرشید ترابی امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر پروفیسر راجہ عبدالوحید خان پروفیسر شائق صاحب، ڈی آئی جی راجہ شفیق خان، کرنل راجہ وحید خان، کرنل راجہ اشرف خان اور کرنل راجہ گل افسر خان جیسی مشہور شخصیات کا تعلق ہے۔

علاقہ نرماہ کے مشہور گاؤں اور قصبے کالاڈب، دبلہاہ راجگان، پلاہل کلاں، پلاہل خورد اور پراہی ہیں۔نرماہ کی کثیر آبادی نرماہ گاؤں ہی میں آباد ہے جو کہ بالی ماہ کے پہاڑ کے دامن میں ایک خوبصورت علاقہ ہے۔ یہ ساری آبادی ایک ہی قبیلہ پر مشتمل ہے جواپنا جداعلیٰ راجہ جگدیو ہی کو مانتے ہیں جو کہ نارمہ راجپوت تھا۔اسی جگدیو کی اولاد سے راجہ نارسنگھ بھی ہوا ہے جو کہ اہلیان نرماہ کے اجداد میں شمار ہوتا ہے۔اگر ہم نارسنگھ اور کرن سنگھ کو تاریخی حوالے سے دیکھیں تو نارمہ راجپوتوں کی لڑی میں یہ دونوں نام ناپید ہیں۔مگر قیاس ہے کہ تاریخ میں ان دونوں کے نام یا القاب کچھ اور ہوں جس کا سراغ مشکل ہے۔نرماہ کے ذیلدار اور سفید پوش بھی ہمیشہ نارمہ ہی رہے ہیں جبکہ ایک گھرانہ قاضی اور ملاں بھی کہلایا۔نارموں میں اکثر اہل ثروت چوہدری اور اہل علم قاضی کے خطابات سے بھی مشہور ہوئے ہیں جیسے کفل گڑھ باغ کے قاضی عالم خان، قاضی عالم دین، مولوی عبداللہ صاحب اور مولوی جنگ باز صاحب جیسی عالم ہستیاں ماضی قریب میں ہوگزری ہیں۔

نرماہ کے ذیلداروں کا شجرہ کھمباہ کے راجہ سردار سنگھ ذیلدار سے ملتا ہے جن کے عزیز وا قارب بڑوہ، تندڑ، کانگڑی اور بھجوال کے علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔اس گھرانے کی رشتہ داریاں نرماہ میں بھی تھیں جہاں سردار سنگھ کے نام ایک ونڈ داری قدیم عرصہ سے یعنی اس کے آباواجداد کے زمانہ سے چلی آرہی تھی۔سردار سنگھ کا بھائی جسے اکثر شجروں میں سوتیلا بھائی لکھا گیا ہے کو کسی بزرگ کے ہاتھوں اسلام قبول کرنے کے بعد گھر سے نکال دیا گیا۔سردار سنگھ کے اس سوتیلے بھائی کا نام غیدی خان لکھا گیا ہے جس کا نام قبول اسلام کے بعد بھی غیدی ہی رہا۔غیدی خان اپنے مرشد کے ہمراہ عرصہ تک ہندوستان، ایران اور افغانستان کی سیاحت پر رہا اور مرشد کے چل بسنے کے بعد تندڑ کے قریب سنداڑ کے مقام پر ڈیرہ لگایا۔غیدی خان کی اولاد سے دولڑیاں نکلیں اور بعد کے دور میں یہ لوگ بیانس کے مقام پر اور پھر بزور قوت نرماہ میں داخل ہوئے اور محلّہ دبلہاہ راجگان کی بنیاد رکھی۔ چونکہ غیدی خان مسلمان ہو چکا تھا لہٰذا ہندو قانون کے مطابق اسے اپنے والد کی زمین و جائیداد سے حصہ نہیں مل سکتا تھا اس لئے وہ ویرانے میں آباد ہوا جبکہ اس کی اولاد نے نرماہ کی ونڈ داری پر زبردستی قابض ہو کر دبلہاہ راجگان میں سکونت اختیار

کی۔ دلہاہ راجگان میں مقیم راجہ معظم خان اور راجہ نواب خان نرماہ کے ذیلدار اور نمبر دار ہوئے ہیں اور آج بھی یہاں ان کی اولاد آباد ہے۔ معظم خان ذیلدار کے بعد ان کا بیٹا راجہ تانوں خان سفید پوش و ذیلدار ایک صاحب علم و فضل شخصیت ہوگزرے ہیں۔ تانوں خان علاقہ دار نے کچھ عرصہ فوج میں بھی ملازمت کی اور بسلسلہ روزگار افغانستان، ایران سمیت سارے کشمیر اور ہندوستان کی سیاحت کی۔ راجہ تانوں خان پیشے کے لحاظ سے حکیم تھے جنہیں حکومت وقت نے حکمت گری کی سند دے رکھی تھی۔ تانوں خان نے چار شادیاں کیں جن میں ایک بیوی افغان دوسری تھکیال، تیسری بلوچ اور چوتھی سدھن تھیں جن کا نام سردار بیگم تھا۔ سردار بیگم کا تعلق پلندری کے سدھن خاندان سے تھا۔ تانوں خان سفید پوش و ذیلدار کے چار بیٹے تھے جن کے نام راجہ بہادر علی خان، راجہ غلام محمد خان، راجہ حفیظ خان اور راجہ وزیر خان تھے۔ وزیر خان نوعمری ہی میں فوت ہو گئے جبکہ بہادر علی غلام محمد اور حفیظ خان فوج میں بھرتی ہوئے اور مختلف جنگوں میں لڑتے ہوئے دارفانی سے کوچ کر گئے۔

راجہ تانوں خان کے بعد ان کا بیٹا غلام محمد خان علاقہ دار کو ذیلداری اور سفید پوشی ملی مگر جنگجوحانہ طبیعت نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ غلام محمد صاحب نے علاقہ داری کا کام اپنے بھائی بہادر علی کے سپرد کیا اور پہلی عالمگیر جنگ میں کام آئے۔ کئی ماہ بعد برطانوی حکومت نے ان کی رحلت کا پیغام ان کے بڑے بیٹے ذیلدار سفید پوش راجہ ولائت خان کو بھجوایا اور ان کے والد کی جرأت، بہادری اور استقلال کی داستان کانسی کی پلیٹ پر لکھوا کر بھیجی۔ غلام محمد صاحب کی وفات کے بعد انگریز سرکار نے راجہ ولائت خان اور ان کے بھائیوں کی پنشن مقرر کی اور سائیوال میں وسیع زمین بھی آلاٹ کی۔ علاقہ داری اور ذیلداری کا منصب انہیں حاکم کشمیر سے ملا جو کہ ان کی وفات تک قائم رہا۔ راجہ ولائت خان ذیلدار کے دونوں بھائی راجہ عبداللہ خان اور مولوی محمد اشرف صاحب بھی فوج میں بھرتی ہوئے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمنی اور جاپان میں طویل قید کاٹی۔ رہائی کے بعد دونوں بھائی واپس آئے تو کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ عبداللہ صاحب اور مولوی اشرف صاحب نے آزادی کی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ بعد میں مولوی اشرف صاحب محکمہ جنگلات میں بھرتی ہوئے اور فاریسٹ آفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر ۱۰۳ سال کی طویل عمر میں وفات پا گئے۔

راجہ سخی ولائت خان سفید پوش وذیلدار

اپنے والد راجہ غلام محمد کی وفات کے بعد علاقہ نرماہ کی نمبرداری ذیلداری اور سفید پوشی راجہ ولائت خان کو ملی۔ والد کی وفات کے وقت راجہ ولائت خان کی عمر بارہ سال تھی جن کے لئے اس وقت کے لحاظ سے یہ منصب سنبھالنا ایک مشکل امر تھا۔ راجہ ولائت خان ایک خوش شکل اور جرأت مند آدمی تھے جنہوں نے اس منصب کا خوب پاس کیا اور سارے علاقہ میں اپنی بیبا کی اور فیاضی کا لوہا منوایا۔ راجہ صاحب ولائت خان بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ کی ذہانت اور سیاسی بصیرت نے اس علاقہ کی خوشحالی اور امن میں اہم رول ادا کیا۔ آپ نے قاضی محمد جان صاحب آف میر پور کی معاونت سے غریب لوگوں کے لئے قرضہ کا اجرا ڈوگرہ حکومت سے کروایا اور نرماہ کے لوگوں کو کپڑا بنانے کی ترغیب دی۔ اس سلسلہ میں بہت سے مقامات پر ہتھکھڈیاں قائم ہوئیں جن پر عمدہ قسم کا کھدر بننے لگا جس کی وجہ سے لوگوں کے معاشی حالات ٹھیک ہو گئے۔ آپ کی کوششوں سے پلاہل کلاں میں لڑکیوں اور لڑکوں کا پرائمری سکول اور یونانی ڈسپنسری قائم ہوئی اور عوام الناس کے بہت سے مسائل حل ہو گئے۔ آپ کے ان اصلاحی اور فلاحی کاموں میں چوہدری نور محمد مرحوم چیئرمین یونین کونسل راجدھانی، بابو غلام قادر مرحوم، جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم، جناب سیّد زمان شاہ صاحب مرحوم، جناب قاضی محمد جان مرحوم آف سہوٹھہ ضلع میر پور اکثر ہاتھ بٹاتے تھے اور اپنے چھوٹے بڑے منصوبوں میں عوام کی شمولیت کو اولیت دیتے تھے۔

آپ نے پلاہل کلاں میں لڑکیوں کا سکول اور ڈسپنسری تو حکومت سے منظور کروالی مگر حکیم کی رہائش اور خوراک سے حکومت نے معذرت کر لی۔ اس سلسلہ میں ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر میر پور نے آپ کے نام خط میں واضح کیا کہ حکومت کے پاس اتنے فنڈز نہیں کہ یونانی ڈسپنسری کے لئے حکیم تعینات کرے۔ اگر آپ حکیم کے اخراجات اور رہائش کا بندوبست کر دیں تو حکومت تعاون کر سکتی ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں بھرپور تعاون کیا اور عرصہ تک حکیم صاحب کے اخراجات اپنی جیب سے برداشت کر کے عوام کیلئے علاج مُعالجہ کی سہولت برقرار رکھی جبکہ ڈسپنسری کی عمارت نہ ہونے کی وجہ سے چوہدری نور محمد مرحوم نے اپنے ذاتی مکان کا ایک حصہ ڈسپنسری اور دوسرا پرائمری سکول کے لئے وقف کیا۔ اے

کاش! یہ روایات آگے بڑھتی اور اخوت اور بھائی چارے کی یہ فصل پھلتی پھولتی مگر شومئی قسمت کہ بعد کے دور میں محبت اور اخوت کی فضا برقرار نہ رہی اور نفرت کی بدبو نے دل کے چمن سے خوشبو کے معطر جھونکے ہمیشہ کیلئے ختم کردے۔

لڑکیوں کے سکول کے لئے اُستانی کا حصول غیر ممکن ہوا تو راجہ ولائت صاحب نے اپنی زوجہ محترمہ پکھراج بیگم جو کہ جموں کی رہنے والی تھیں اور سانبہ گرلز مڈل سکول کی صدر معلّمہ تھیں سے گزارش کی کہ وہ صدر معلّمہ کا عہدہ چھوڑ کر پرائمری سکول کی معلّمہ بننے کے لئے قربانی دیں تاکہ پلاہل کلاں میں منظور شدہ سکول کسی اور جگہ منتقل نہ ہو۔ آپ کی طرح آپ کی بیگمات میں بھی عوامی خدمت کا جذبہ تھا لہٰذا محترمہ پکھراج بیگم نے اپنا عہدہ چھوڑ کر اپنی تعیناتی پلاہل کلاں میں کروائی اور عرصہ تک علاقہ کی بچیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتی رہیں۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں سانبہ مڈل سکول کی طالبات بھاگ کر جموں پہنچیں تو محترمہ پکھراج بیگم نے راجہ صاحب کی اجازت سے سیالکوٹ میں ان کی رہائش کا انتظام کیا۔ تقسیم کے بعد آپ عرصہ تک سیالکوٹ کے مختلف سکولوں میں بطور ہیڈ مسٹریس تعینات رہیں۔ آپ سیالکوٹ کے گاؤں رندھاوا میں فوت ہوئیں اور وہی آسودہ خاک ہیں۔ راجہ صاحب نے سیّد زمان شاہ صاحب کی مدد سے پیر گلی تا کالا ڈب سڑک اپنی مدد آپ کے تحت بنوائی۔ بعد میں یہ سڑک چڑہوئی سے کھوئیرٹہ اور کوٹلی کے درمیان اہم رابطہ بن گئی۔ حیرت کی بات ہے کہ آج ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی اس سڑک کے سروے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور جس طرح یہ سڑک اپنی مدد آپ کے تحت بنائی گئی تھی اسی پر حکومت نے تارکول ڈال کر ۱۹۶۵ء میں اسے پختہ کیا مگر بعد میں کبھی بھی اس سڑک کی مرمت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

آزاد کشمیر حکومت کے قیام کے بعد آپ نے حکومتی اداروں کی بھی معاونت کی اور پنچائت کا بہترین نظام وضع کر کے عدل و انصاف اور رواداری کی بہترین مثالیں پیش کیں جنہیں آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ آپ کا گھر علاقہ کا لنگر خانہ تھا جہاں علاقہ بھر کے لوگ کام کرتے اور کھانا کھاتے تھے۔ آپ کی آمدنی کا ذریعہ زمینوں میں پیدا ہونے والی فصل، مال مویشی اور جنگلات کی ٹھیکیداری تھی۔ اس آمدنی سے جو کچھ گھر میں آتا اس سے دن رات لنگر چلتا اور لوگوں کو روٹی ملتی۔ آمدنی کے وافر وسائل کے باوجود آپ ہمیشہ سفید پوش ہی رہے اور کوئی ظاہری مال و دولت اکٹھا نہیں کیا۔ لڑکیوں کی دینی تعلیم کے

لئے آپ نے اپنا ایک مکان دینی مدرسہ کے لئے وقف کیا اور گجرات کے ایک بڑے عالم دین حافظ قاری سائیں فیروز شاہ صاحب مرحوم اوران کی بیگم کو اپنی گرہ سے معاوضہ دیکر کئی سالوں تک یہ مدرسہ جاری رکھا تا کہ خواتین کو دین کی سمجھ آئے اور وہ اچھی مائیں بن کر قوم کی آبیاری کریں۔آپ کی تین بیویوں میں سے ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔آپ کی زوجہ محترمہ پکھراج بیگم کا تعلق جموں سے تھا اور وہ تعلیم کے پیشہ سے وابستہ تھیں جن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔راجہ سخی ولائت خان ذیلدار وسفید پوش فقراً اور علماً کی بے حد قدر کرتے تھے اوران کی خدمت میں ہمیشہ حاضری دیتے۔

آپ حضرت سائیں رفع اللہ خانؒ کے مرید تھے جن کا تعلق وادی بناہ سے تھا۔سائیں رفع اللہ خانؒ،حضرت مائی طوطی سرکارؒ،سائیں فتو صاحبؒ اور حضرت پیر بڈیسرؒ ایک ہی لڑی کے فقراًاور وادی بناہ کے چار روحانی ستون ہیں۔سائیں رفع اللہ خان صاحبؒ کراماتی فقیر تھے اور اکثر خاموش رہتے تھے۔سائیں رفع اللہ خان صاحبؒ کی ظاہری ہئیت روایتی پیروں فقیروں جیسی نہیں تھی۔وہ صاحب ثروت اور جاگیردار بھی تھے۔سائیں صاحبؒ اکثر سفر پر رہتے اور سواری کے لئے بہترین گھوڑے خریدنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔اس ظاہری شان وشوکت کے ساتھ ساتھ سائیں صاحبؒ کا تزکیہ ومجاہدہ بھی اپنے کمال پر تھا۔سائیں رفع اللہ خانؒ کی طبیعت جلالی تھی۔وہ ساری عمر روزے سے رہے اور راتیں عبادات میں گزاریں۔جب سفر پر نہ ہوتے تو اکثر جنگل میں تنہا رہتے اور چلہ کشی کرتے۔سائیں رفع اللہ خانؒ صاحبِ اولاد بھی تھے اور اکثر اپنی زمین وجائیداد کا خود خیال رکھتے۔سائیں رفع اللہ خانؒ کی زندگی میں ایک بہترین توازن تھا اور وہ اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔سائیں رفع اللہ خانؒ نے اپنے مرید خاص راجہ سخی ولائت خان کی بہترین تربیت کی اور وہ انہیں دنیا کے کاموں کے ساتھ ساتھ دینی اور روحانی تعلیمات سے بھی آراستہ کر کیا۔سائیں رفع اللہ خانؒ کی ہدایت پر راجہ صاحب نے ایک مسجد بنوائی جہاں کئی ماہ تک چلہ کشی کر کے روحانیت میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔اس چلہ کشی کے بعد آپ کو حکم ملا کہ سرینگر جا کر جناب راجہ سخی ولائت (ڈی ایف او) جن کا تعلق موضع سہار ضلع میر پور سے تھا سے روحانی فیض حاصل کریں۔راجہ سخی ولائت (ڈی ایف او) ایک صاحب علم وکمال ہستی تھیں۔سخی صاحب لاگریجوایٹ تھے اور آپ نے علی گڑھ سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔سخی ولائت صاحب موضع سہار کو چھوڑ کر سرینگر ہی میں آباد ہو گئے تھے اور جناب قبلہ مولوی محمد امین صاحب اویسیؒ کے مرید تھے۔

آپ کی نسبت سے کشمیر میں سلسلہ اویسیہ کا اجرأ ہوا جو تا حال اپنی پوری شان سے جاری وساری ہے اور ہزاروں طالبان حق کی روحانی تربیت کر کے دلوں کو مادیت کی آلودگی سے پاک کر رہا ہے۔

ذیلدار راجہ سخی ولائت صاحب نے سلسلہ اویسیہ میں شامل ہو کر روحانی علوم سے فیض حاصل کیا۔ آج بھی اس خاندان کے سبھی افراد اسی سلسلہ سے وابستہ ہیں اور جناب قبلہ محمد نورالدین اویسیؒ کاشمیریؒ کے مرید ہیں۔ قبلہ محمد نورالدین اویسیؒ اپنے پیرومرشد جناب مولوی محمد امین اویسیؒ کے خلیفہ تھے اور اپنے مرشد کے حکم کے مطابق سرینگر کشمیر سے ہجرت فرما کر پاکستان چلے آئے۔ آپ کچھ عرصہ تک لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں مقیم رہے اور بعد میں ایبٹ آباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ تقریباً نصف صدی تک آپ اپنے اس مسکن سے دین حق کی تبلیغ کرتے رہے اور جس مشن کی تکمیل کے لئے آپ کے مرشد نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا اس کی بجا آوری کرتے ہوئے ۸ مارچ ۱۹۹۷ء کو اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔

علاقہ نرماہ، کالاڈب، اور ملحقہ پلاہل خورد وکلاں، کالی دھار اور بالی ماہ کے سلسلہ کوہ کے درمیان ایک خوبصورت وادی ہے جو ضلع میرپور، کوٹلی اور بھمبر کے جنکشن پر واقع ہے۔ اس وادی کو تین بڑے نالے جو سارا سال بہتے ہیں تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ نرماہ کا گاؤں بالی ماہ پہاڑ کے عین دامن میں ہے جبکہ کھڈال ساہ اور دبلہاہ راجگان اس کی اگلی ڈھلوانوں اور گہرائی میں آباد ہیں۔ بالی ماہ کی چوٹی پر کسی بزرگ کا دربار ہے جو کہ صدیوں سے اس پر فضا مقام پر گمنامی کی کیفیت میں آسودہ خاک ہے۔ اس بزرگ ہستی کا نام اور تاریخ وفات کا کسی کو علم نہیں۔ ایسی چند قدیم قبریں اور مزارات دبلہاہ راجگان کے قریب بھی موجود ہیں جن کی تاریخ سے کوئی واقف نہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں دین اسلام ان ہی بزرگان دین کی وجہ سے پھیلا۔ تاریخ چِب کے مصنف کے مطابق چِب قوم کے جدامجد بابا شادی شہید نے جن ملنگوں کے کرشمہ وکرامات ظاہری سے متاثر ہوکر مسافروں کی رہائی اور ان کے سامان کی واگزاری کا حکم دیا ان ملنگوں کا تعلق بھی پلاہل خورد سے ہی تھا جسے عرف عام میں پنج پیر کہا جاتا ہے۔

پلاہل خورد کوٹلی اور میرپور کو ملانے والے پرانے راستے پر موجود ہے جہاں تقسیم سے پہلے ایک مسافر خانہ، ڈاک بنگلہ، تالاب اور پڑاؤ تھا۔ پنج پیر کی کرامات اور شادی شہید کا واقع مغلیہ دور کا ہے۔ اسکا ذکر تاریخ چِب کے علاوہ دوسری کتب میں بھی موجود ہے۔ اس دور میں بابا شادی شہید نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور بھمبر کے علاقہ میں ایک مضبوط چِب حکمرانی قائم تھی۔ شادی شہید جن کا اصل نام راجہ چِب چند تھا بھمبر کے حکمران تھے اور ان کی رانی کا تعلق تھکیال قوم سے تھا۔

پلاہل خورد میں اہل حرفہ کے علاوہ آج بھی زیادہ آبادی نارمہ راجپوتوں کی ہے۔ تاریخ سے ثابت ہیں کہ پلاہل کلاں میں نارمہ راجپوتوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم کبھی آباد نہ تھی۔ تاریخ اقوام پونچھ کے مصنف محمد دین فوق کے مطابق پلاہل خورد وکلاں میں نارمہ راجپوت ہی آباد تھے مگر دور حاضر میں پلاہل کلاں کی بڑی آبادی جٹ قوم پر بھی مشتمل ہے جن میں چوہدری نور محمد، بابو غلام قادر اور مشہور عالم دین مولوی سیّد محمد صاحب مرحوم جیسی مشہور ہستیاں ہوگزری ہیں۔ مولوی سیّد محمد کے سسر اور استاد

محترم جناب مولوی عبداللہ خان صاحب ایک درویش صفت عالم دین تھے جو کسی زمانہ میں ضلع ہزارہ صوبہ سرحد سے نقل مکانی کر کے پلاہل کلاں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مولوی عبداللہ صاحب کا مزار پلاہل کلاں میں ہی موجود ہے۔

جس طرح مولوی عبداللہ صاحب ہزارہ سے پلاہل کلاں میں آباد ہوئے ہوسکتا ہے پلاہل کلاں میں آباد جٹ قوم بھی کسی وجہ سے پنجاب کے کسی علاقہ سے ہجرت کر کے اس علاقہ میں آباد ہوئی ہو۔ تاریخ کے حوالے سے اور ہندو عقیدے کے مطابق جٹ قوم ھیم کی اولاد سے ہے جو کہ چوہان راجپوتوں کی گوت کے قریب ترین ہے۔ اسی عقیدے کے مطابق چوہانوں کا تعلق اگنی بنس سے ہے اور نارمہ قوم بھی اسی بنس سے بتلائی جاتی ہے۔ ہندو دیو مالائی کہانیاں اور قصے دنیا کی قدیم ترین روایات اور عقائد کا مجموعہ سمجھی جاتی ہیں۔ جس سے سر دست انحراف ممکن نہیں۔ یہ عقیدہ معجزات کا معترف ہے اور معجزات سے آج بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ باطنی علوم سے متعلق اصحاب اس بات سے متفق ہیں کہ تزکیہ نفس اور محنت سے انسان ناسوتی کرامات کا حامل ہوسکتا ہے جس کے لئے کسی خاص عقیدے دین اور مذہب کی ضرورت نہیں ان ناسوتی کمالات اور پھر ان پر مبنی روایات کا نام ہی مائیتھالوجی ہے۔

اگنی بنس کا عقیدہ، نارمہ اور چوہان اقوام کا ھیم سے تعلق اس بات کی دلیل ہے کے پلاہل کلاں میں آباد جٹ قوم کا بھی کوئی تعلق باقی آبادی سے جڑتا ہے چونکہ یہ قبیلہ صرف جٹ ہی لکھتا ہے انہیں اپنی کسی گوت یا شاخ کا پتہ نہیں۔ تاہم ہم نے جن شخصیات کا ذکر پچھلی سطور میں کیا ہے ان کے گہرے روابط نارمہ قوم خاص کر راجہ ولائت خان ذیلدار وسفید پوش سے رہے ہیں اور راجہ صاحب کو ہی یہ لوگ اپنا سردار اور قائد مانتے تھے۔

گاؤں نرماہ کی مشہور شخصیات قاضی ملو اور قاضی بدھو ہو گزریں ہیں جن کے علم و فضل کا خوب چرچا تھا۔ ان کے علاوہ حضرت میاں قطب دینؒ صاحب مشہور روحانی شخصیت ہو گزرے ہیں جو کہ صاحب کشف و کرامات ہستی تھے۔ ان مسلمان قبیلوں اور برادریوں کے علاوہ تقسیم سے قبل پلاہل خورد و کلاں، کالاڈب، ساہ اور ملحقہ کینڈ اور بیانس میں ہندو بھی رہتے تھے جو کہ بخشی اور مہتا کہلاتے تھے۔

ان ہندوؤں کے سردار اور نمبردار بخشی ایشور، بخشی لعل اور مہتا حکم چند تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کے ڈوگرہ حکمرانی اور امیر ہندو گھرانوں کی علاقہ میں موجودگی کے باوجود علاقہ کی سرداری ذیلداری

اور سفید پوشی کا منصب نارمہ قوم ہی کے پاس تھا اوران ہندو ساہوکاروں اور سرداروں نے بھی مسلمان برادریوں کی تقلید میں اپنا لیڈر اور قائد ذیلدار راجہ ولائت خان ہی کو تسلیم کیا چونکہ ذیلدار صاحب کی شخصیت اور کردار کے سبھی قائل تھے اوران کے کیے ہوئے فیصلوں کو دین ودھرم کا حصہ سمجھ کر مانتے اور عمل کرتے تھے۔

اس دور میں علاقہ نرماہ تحصیل کوٹلی ضلع میر پور کا حصہ تھا اور میر پور شہر کی کثیر آبادی ہندوڈوگروں پر مشتمل تھی۔ میر پور کے ہندوڈوگرے، جاٹ اور دیگر ہندواقوام آسودہ حال تعلیم یافتہ اور حکمران حیثیت کی مالک تھیں۔ میر پور میں ڈوگرہ پولیس کی ایک رجمنٹ کے علاوہ ایک ملٹری گیریژن تھا جسکا کمانڈر بریگیڈیئر ہوتا تھا۔ ضلع میر پور کے مشہور تھانے بھمبر، سماہنی (چوکی) نوشہرہ، کھوئیرٹہ اور کوٹلی میں تھے جہاں پولیس کی بھاری جمعیت موجود رہتی جو کے زیادہ تر ڈوگرہ ہندو ہی ہوتے تھے۔

جنگ آزادی میں راجہ صاحب کی خدمات

۱۹۴۷ء میں تحریک آزادی کشمیر کا آغاز ہوا تو دیگر مسلمان ذیلدارں نمبرداروں اور سرکردہ رہنماؤں کی طرح علاقہ نرماہ کے ذیلدار وسفید پوش راجہ ولائت خان نے اپنے علاقہ کے نمبرداروں اور برادریوں کے سربراہان کو بلا کران سے مشاورت کی کہ علاقہ کا دفاع کس طرح کیا جائے اور ہندو آبادی جو کہ غیر مسلح افراد پر مشتمل تھی کی حفاظت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔اس مشاورتی کونسل کے روح رواں لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید ستارہ جرأت (دوبار) تھے۔علاقہ پنجن اور نرماہ کے علاوہ جن سرکردہ شخصیات نے اس پنچائیت میں حصہ لیا ان میں چوہدری نواب دین (چوہدری نابہ) نمبردار پونہ، راجہ جان محمد (راجہ جانی خان) آف سہار، راجہ سائیں سخی محمد آف سہار، راجہ باسا خان والد محترم راجہ فقیر محمد خان انسپکٹر پولیس آف بیانس، راجہ محبت خان ذیلدار تندڑ اور دیگر سرکردہ ہندو پنچ اور نمبردار بھی شامل ہوئے۔

اس پنچائیت میں فیصلہ ہوا کہ سراہ اور پنجن کے علاقہ کی ہر حالت میں حفاظت کی جائے اور حملہ آور ڈوگرہ افواج کو اس علاقہ میں نہ آنے دیا جائے۔اگر میر پور سے براستہ پنج پیر اور پیر گلی ہندو آبادی نوشہرہ اور جموں جانا چاہے تو انھیں روکا نہ جائے۔جو ہندو اپنے علاقہ میں پرامن رہنا چاہتے ہوں ان پر کوئی پابندی نہ ہو اور ہندو ہنگامی حالت کے دوران اپنے گاؤں اور محلے نہ چھوڑیں۔جو ہندو نقل مکانی کرنے کا ارادہ کریں وہ مقامی آبادی کو اطلاع دیں اور مسلم آبادی ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہوگی۔

اس پنچائیت کی برخواستگی کے بعد کالا ڈب، بیانس اور پلاہل خورد کی بیشتر ہندو آبادی نقل مکانی کر گئی مگر بعد میں کچھ لوگ ہنگامہ آرائی کی نظر بھی ہوئے جبکہ بہت سے قبیلے اپنے گھر بار چھوڑ کر دلہاہ راجگان میں راجہ ولائت خان صاحب کے ہاں پناہ گزین ہوئے جنہیں بحفاظت براستہ نوشہرہ جموں بجھوا دیا گیا۔

راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اشرف صاحب فاریسٹ آفیسر اور راجہ صاحب کی بیگم محترمہ فاطمہ بیگم مرحومہ جو ڈوگرہ راج کے عروج کے زمانہ میں دین اسلام قبول کر کے راجہ صاحب کے عقد میں آئیں کی کوششوں اور تبلیغ سے متاثر ہو کر بہت سے پناہ گزین ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے اور

آج بھی اسی علاقہ میں آباد ہیں۔

ہندو آبادی کی پرامن نقل مکانی اور دیگر کے قبول اسلام کا سہرا بھی راجہ ولائت خان کے سر ہے اوران کی قائدانہ صلاحیتوں کا مہنہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد اس بات کا خدشہ تھا کہ نوجوان ہندو ڈوگرہ اور بھارتی افواج کے گائیڈ بن کر دوبارہ اس علاقہ پر قابض ہوں گے اور حملہ کرنے کی کوشش کرینگے۔ یہ خدشہ اس لئے بھی بڑھ گیا چونکہ پولیس تھانوں میں ڈوگرہ پولیس کے ساتھ ڈوگرہ فوج بھی تعینات کردی گئی اور میر پور گیریژن میں بھی فوج کی تعداد بڑھا دی گئی جسکا کمانڈر بریگیڈ ئیر ککری کو مقرر کیا گیا۔اس حملے کی ایک وجہ جذبہ انتقام بھی ہوسکتا ہے چونکہ بعض جاہل اور لالچی قسم کے لوگوں نے محض لوٹ مار کی خاطر کچھ ہندو گھرانوں کو لوٹا اور راستوں میں ناکے لگا کرانہیں قتل بھی کیا۔ قتل وغارت اور لوٹ مار کی خبریں جب نوشہرہ اور جموں پہنچیں تو انتقاماً وہاں پر بھی سفا کی کا مظاہرہ ہوا اور لاکھوں مسلمان تہہ تیغ کر دیئے گئے۔

لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید ستارہ جرأت (دو بار) نے راجہ ولائت خان ذیلدار اور دیگر سر کردہ رہنماؤں کی مدد سے علاقہ پنجن نرماہ اور سراہ کی حفاظت کا جو منصوبہ بنایا اس کے خدوخال کچھ اس طرح تھے۔ سراہ سے ناڑا کوٹ براستہ کیری اور کھمباہ سے تندڑ اور ہری پور سے کالا ڈب آنے والے راستوں پر مسلح دستے تعینات کئے جائیں اس سلسلہ میں سابق فوجیوں اور ان افراد کا چناؤ کیا گیا جن کے پاس ذاتی ہتھیار تھے۔ اس دور میں زیادہ تر لوگوں کے پاس توڑے دار رائفلیں اور بارہ بور کی دیسی ساخت کی بندوقیں برچھیاں اور تلواریں وغیرہ ہوتی تھیں۔ ان مسلح افراد کو لیفٹیننٹ مظفر خان نے چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے سارے محاذ پر پھیلا دیا تا کہ تمام ممکنہ راستوں کی دیکھ بھال ہو سکے۔ اس وقت تک میر پور گیریژن پر قبائلی دستوں نے دباؤ بڑھا دیا تھا اور شہر سے نکلنے کے راستوں کی موثر ناکہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ میر پور میں محصور فورس کا گھیراؤ ختم کرنے اور میر پور نوشہرہ روڈ کی بحالی کے لئے بھارتی فوج کا ایک بریگیڈ جسے ہلکے ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور انڈین ائیر فورس کی بھر پور مدد حاصل تھیں کا لیفٹیننٹ مظفر خان کے دستے بہ جگری سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ان دستوں کے لئے راشن سپلائی اسلحہ ترسیل اور دیگر انتظامات ذیلدار راجہ سخی ولائت صاحب کی ذمہ داری تھی۔ راجہ صاحب نہ صرف اگلے محاذ پر لڑنے والوں کے لئے کمک کا بندوبست کر رہے تھے بلکہ مقامی آبادی کا تحفظ اور نئے آنے والے مجاہدین کو بحفاظت محاذ جنگ تک پہنچانا بھی آپ ہی کے ذمہ تھا۔ آپ نے گاؤں دلہاہ راجگان سے خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو محفوظ مقام پر بھجوا دیا اور محاذ جنگ سے قریب تر سبز کوٹ اور پنجن سے خواتین بچوں اور بوڑھوں کے لئے اپنے محلے کا ایک حصہ وقف کر کے اس پر پہرہ لگوا دیا۔ سبز کوٹ کے سارے گھروں کو اسلحہ خانہ اور طبی چوکیوں میں بدل دیا گیا جہاں سے اسلحہ وایمونیشن ضرورت کے مطابق اگلے مورچوں پر بھیجا جاتا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے بعد انہیں ہسپتالوں کی طرف روانہ کیا جاتا۔

میر پور گیریژن پر قبضے کے بعد جب مجاہدین اور لشکری پونہ اور پنجن کی طرف بڑھے تو راجہ صاحب کی ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ آپ نے بہت سے گاؤں اور قصبے خالی کروا کر لشکریوں کے لئے رہائش کا بندوبست کیا تا کہ مقامی آبادی اور پٹھان قبائل میں کسی قسم کا تصادم نہ ہو۔ لشکریوں اور

مقامی آبادی کے رسم ورواج اور معاشرتی ماحول میں فرق کی وجہ سے کئی مقامات پر حادثات بھی ہوئے جس کی وجہ سے بداعتمادی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ راجہ سخی ولائت خان ذیلدار نے کسی ممکنہ حادثہ کی روک تھام کا با قاعدہ منصوبہ بنا کر راشن اور ایمونیشن کی ترسیل لشکریوں کے کیمپوں کے لئے مخصوص مقامات کا تعین اور انہیں محاذ جنگ تک لے جانے کے لئے گائیڈ اور رہنما مقرر کر دیئے اور انہیں مقامی آبادی سے دور رکھا۔

میر پور کی تسخیر کے بعد مجاہدین کے دستے اور قبائلی لشکر آگے پہنچے تو لیفٹیننٹ مظفر خان کے دستوں پر دشمن کا زور بھی بڑھ گیا۔ لیفٹیننٹ مظفر خان شہید نے جس جرأت بے باکی اور استقلال سے لمبے عرصے تک دشمن کی بھاری یلغار کو روکے رکھا اسے بیان کرنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے جسے انشاٗ اللہ آنے والے وقت میں سپرد قلم کیا جائے گا۔ گو کہ مجاہدین کی کمک پہنچنے کے بعد راجہ مظفر خان کی پوزیشن کچھ بہتر ہوگئی اور ایمونیشن اور اسلحہ کی کچھ ضروریات بھی پوری ہونے لگی مگر اتنی بڑی فورس کے لئے خوراک کا بندوبست مشکل ہو گیا۔

اس تکلیف کو دور کرنے کیلئے راجہ سخی ولائت صاحب نے علاقہ میں راشن بندی کروادی اور عوام سے اپیل کی کہ جب تک حکومتی سطح پر مجاہدین کے لئے راشن کا بندوبست نہیں ہوتا لوگ اپنا فالتوں غلہ اور مویشی مجاہدین کیلئے وقف کر دیں۔ آپ کی اپیل پر لوگوں نے لبیک کہا اور دل کھول کر مجاہدین کی مدد کی اور انہیں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دی۔ راجہ صاحب نے اپنے گھرانے کے سارے مال مویشی اور غلہ مجاہدین کے حوالے کر دیا اور جو کچھ آپ کے پاس تھا اس سے جہلم اور سرائے عالمگیر سے خوراک کا سامان خرید کر مجاہدین کی خدمت کے لئے بھجوادیا۔ آپ کی ان خدمات کا اعتراف افغان جرنیلوں، لشکری سپہ سالاروں اور مجاہدین کے ساتھ جہاد آزادی میں مصروف فوجی افسروں نے اپنے خطوط اور پیغامات میں کیا۔ لشکر دیر کے سپہ سالار اعلیٰ حضرت عالی نے اپنے خط میں راجہ صاحب ذیلدار سخی ولائت خان سفید پوش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ گو آپ محاذ جنگ پر نہیں ہیں مگر زخمیوں اور شہیدوں کا انخلاٗ راشن اور ایمونیشن کی سپلائی کا جو مشن آپ بطریق احسن پورا کر رہے ہیں اس سے مجاہدین کا حوصلہ بڑھتا ہے اور ہم سب آپ کو کسی نہ کسی صورت اپنے درمیان ہی پاتے ہیں۔

ایک ایسے ہی پیغام میں کرنل بی اے خان نے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اتنے لمبے

عرصہ تک جب کے حکومت کی طرف سے مجاہدین کے لئے خوراک کی سپلائی کا کوئی موثر بندوبست نہیں تھا آپ نے اتنی بڑی فوج کے لئے اپنے ذرائع سے خوراک کا بندوبست کر کے جس ہمت استقلال اور سخاوت کا مظاہرہ کیا ہے میں اور میرے ماتحت کمانڈر اور حکومت آپ کی ممنون ہے۔ آپ کی مثالی کارکردگی اور وطن سے محبت دوسرے علاقہ داروں، جاگیرداروں اور ذیلداروں کے لئے ایک روشن مثال ہے۔ جب تک آپ جیسے لوگ اس قوم میں پیدا ہوتے رہیں گے اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

آپ نے جن لشکریوں کی میزبانی کا فریضہ سرانجام دیا ان میں افغانستان کے ایک سابق صدر نور محمد ترا کئی بھی شامل تھے۔ مرحوم نور محمد ترا کئی ایک دستے کے قائد تھے جو کہ دیوتا گولہ کے علاقہ میں ٹھہرا جس کی میزبانی کا شرف بھی راجہ صاحب ہی کو حاصل ہوا۔ یہ دستہ جب واپسی کے لئے اکالگڑھ کیمپ میں پہنچا تو نور محمد ترا کئی بیمار ہو گئے۔ جب راجہ صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے ایک گھوڑی افغان کمانڈر کی سواری کے لئے بھجوائی تا کہ سفر میں دشواری نہ ہو۔ کیمپ کمانڈر نے گھوڑی بمعہ زین وصول کرنے کی رسید کے ساتھ ایک خط بھی راجہ صاحب کو بھجوایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ ذیلدار سفید پوش راجہ سخی ولائت خان نام ہی کے نہیں بلکہ عملاً بھی سخی تھے۔ آپ کے لنگر سے کبھی کوئی بھوکا نہ جاتا۔ علاقہ بھر کے غریب ومساکین آپ کی کفالت میں تھے جن کی خدمت آپ اپنی اولاد کی طرح کرتے۔ آپ نے فرسودہ رسم ورواج ختم کر کے عوام کے لئے کئی آسانیاں پیدا کیں۔ آپ کی زندگی میں شاید ہی کسی مقدمہ کے لئے پولیس علاقہ میں آئی ہو۔ آپ نے اپنے علاقہ کے شرفائ پر مشتمل پنچائت بنا رکھی تھی جو لوگوں کے مسائل سنتی اور انصاف مہیا کرتی تھی۔ آپ کی زندگی میں کسی کو کولوٹ مار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ نے ہندوؤں کے مکانات دوسری جانب سے آنے والے مہاجرین کے حوالے کئے اور ان کی آبادکاری کا بھی بندوبست کیا۔ راجہ سخی ولائت خان ذیلدار وسفید پوش نے انتہائی جرأت مندانہ اور حکمران زندگی گزاری اور ساری عمر عوام الناس کی خدمت کرتے رہے۔ آپ کی تین بیویوں سے پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ۶۵ سال کی عمر میں آپ ۱۹۶۲ء میں اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ آپ کی مثالی زندگی کا اثر آپ کی اولاد پر بھی ہوا جنہوں نے اپنے باپ اور دادا کی اچھی روایات کو مادیت کے اس دور میں بھی زندہ رکھا اور ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اُٹھا کر کلمہ حق کہنے کی خاندانی روایات کو زندہ رکھا۔

الحاج راجہ بشیر احمد خان

ذیلدار سفید پوش راجہ سخی ولائت خان کے لخت جگر الحاج راجہ بشیر احمد خان اپنی پانچ بہنوں کے بعد پیدا ہوئے۔ راجہ بشیر خان نہ صرف اپنی بہنوں اور تین ماؤں کی آنکھ کا تارا تھے بلکہ گھر کے درجنوں نوکروں اور راجہ صاحب کے ہزاروں مداحوں اور سینکڑوں دوستوں کی نیک دعاؤں کا ثمر بھی تھے۔ آپ کی پرورش آپ کے چچا مولوی محمد اشرف صاحب فاریسٹ آفیسر اور آپ کی پھوپھی محترمہ عنایت بیگم نے کی جبکہ آپ کی چچی محترمہ نوشہ بیگمؒ جو کہ مجذوب فقیر تھیں کی آپ پر خاص توجہ تھی۔ راجہ بشیر احمد صاحب کی پرورش انتہائی دینی اور روحانی ماحول میں ہوئی۔ آپ نے دینی تعلیم قبلہ سائیں فیروز شاہ صاحب آف گجرات اور اپنے چچا مولوی محمد اشرف صاحب سے حاصل کی جبکہ اردو اور فارسی ادب جناب ماسٹر امام دین آف کھڈال سے پڑھا۔ ماسٹر امام دین صاحب آف کھڈال فارسی اور اردو ادب کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ماسٹر صاحب نے لکھنو، دہلی اور اجمیر کے دینی مدارس اور فارسی ادب کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ تقسیم سے قبل ماسٹر امام دین صاحب نے لائل پور (فیصل آباد) میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا مگر بعد از تقسیم وہ اپنے گاؤں موضع نرماہ کے محلّہ کھڈال میں آباد ہوئے جہاں وہ ذہین بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے رہے۔ ماسٹر صاحب مرحوم فارسی زبان میں شعر بھی کہتے تھے مگر بوجہ ان کا کلام اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔

گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد الحاج راجہ بشیر احمد خان نے گورنمنٹ مڈل سکول کھوئیرٹہ سے مڈل اور بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول میرپور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس دور میں نزدیک ترین مڈل سکول کھوئیرٹہ میں جبکہ ہائی سکول اور کالج صرف میرپور میں تھا۔

میٹرک کے بعد راجہ بشیر احمد صاحب نے سول انجینئرنگ کا ڈپلومہ حاصل کیا اور کچھ عرصہ آزاد کشمیر کے محکمہ پی ڈبلیوڈی میں بطور سب انجینئر کام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں آپ بسلسلہ روزگار انگلینڈ چلے گئے اور وہی سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی تین بیٹیاں اور چار بیٹے انگلینڈ ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ آپ کی بڑی بیٹی کی شادی آپ کے بھانجے لیفٹیننٹ کرنل راجہ محمد ایوب خان سے ہوئی جو کہ خاندان کی واحد فرد ہیں جن کا قیام کافی عرصہ سے پاکستان میں ہے۔ آپ کا بڑا بیٹا راجہ ظفر اقبال

واکس ہال لمیٹڈ میں سپر وائزر ہے جبکہ دوسرے دو بیٹے راجہ شاہد اقبال اور راجہ اظہر اقبال لوٹن یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں اور کمپیوٹر پروگرامنگ کے شعبہ سے منسلک ہیں۔آپ کا چوتھا بیٹا کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید اپنے خاندان کا سب سے زیادہ ذہین، اسمارٹ اور بہادر بچہ تھا جو میری اس تحریر کا ہیرو ہے۔ میں یہ مسودہ چونلی بوائز ہائی سکول لوٹن (انگلینڈ) کے سبزہ زار میں بیٹھا لکھ رہا ہوں اور ہر سمت مجھے جاوید نظر آ رہا ہے۔فٹ بال گراؤنڈ میں سکول کے بڑے دروازے پر ہائی سکول کی کیاریوں میں کھلے پھولوں اور کھلتی کلیوں میں جاوید ہی دکھلائی دیتا ہے۔ہاں وہ یہیں کہیں ہے چونکہ اس درس گاہ میں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر والد سے اجازت لے کر پاکستان چلا گیا چونکہ وہاں اس کی بہن اکیلی تھی۔اسے اپنی بہن سے بے حد پیار تھا اور وہ انہیں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔جاوید آج بھی اپنی بہن کے ساتھ ہے۔اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی ہے تا کہ اس کی بہن آتے جاتے اپنے بھائی سے ملتی رہے اور کبھی دونوں میں جدائی نہ ہو۔اس نے میر پور کھوئیرٹہ روڈ کے کنارے ایک خوبصورت مکان مزار شہید کی صورت میں بنالیا ہے اور ہر آنے جانے والے کی نگاہ کا مرکز ہے۔

الحاج راجہ بشیر احمد خان کی پرورش آپ کی پھوپھی محترمہ عنایت بیگم اور چچی حضرت مائی نوشہؒ نے کی۔ یہ دونوں خواتین علم وفضل اور روحانی کمالات میں یکتا تھیں۔حضرت مائی نوشہؒ کے کشف وکرامات کے آزاد کشمیر اور پاکستان میں لاکھوں لوگ معترف ہیں اور آپ سے روحانی فیض حاصل کرنے آپ کے دربار پر دن رات حاضری دیتے ہیں۔حضرت مائی نوشہؒ صاحبہ کراماتی ولیہ تھیں اور اکثر جذب کی کیفیت میں رہتی۔حضرت مائی نوشہؒ الحاج راجہ بشیر احمد سے بے حد پیار کرتیں اور ان پر خاص توجہ رکھتیں۔

محترمہ عنایت بیگمؒ راہ سلوک کی مسافرہ تھیں۔آپ کی والدہ محترمہ سردار بیگم کا تعلق پلندری سے تھا اور سدھن قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔حضرت مائی عنایت بیگمؒ نے اپنے شعری مجموعوں میں سدھن قبیلے کی بہادری، دلیری اور جفاکشی کو خاص موضوع بنایا اور تحریک آزادی کشمیر میں سدھن قبیلے کی بہادرانہ مثالیں پیش کیں۔حضرت بی بی عنایتؒ پنجابی اور پہاڑی کی شاعرہ تھیں۔آپ کا مجموعہ کلام " گلدستہ عنایت " اور " عشق حقیقی " آپ کی زندگی میں دو بار شائع ہوا۔آپ نے " گلدستہ عنایت " میں تحریک آزادی کشمیر کے سیاسی، عسکری اور جغرافیائی پہلوؤں کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا۔آپ نے مجاہدین کے

عسکری کارناموں سے عوام الناس کو متعارف کروایا اور کشمیر کے مستقبل کے متعلق کئی پیشن گوئیاں بھی کیں۔آپ کی دوسری تصنیف "عشق حقیقی "ایک خاص انداز میں لکھی گئی جس میں حمد ونعت کے بیان کے ساتھ ساتھ تخلیق کائنات کا بیان بھی ہوا۔آپ کی یہ کتاب حج کے مفصل بیان سے مزین آپ کا سفر نامہ حجاز بھی ہے جس میں آپ نے مناسک حج ، مقامات مقدسہ اور سفر میں درپیش مسائل کا ذکر شعری مجموعہ کی شکل میں کیا۔آپ کے علم وفضل ، زہد وعبادت اور فیاضی وسخاوت کی وجہ سے علاقہ بھر میں آپ کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔آپ خواتین کی روحانی ودینی تربیت کے لئے دورونزدیک کے گاؤں اور محلوں میں درس وتدریس کے لئے تشریف لے جاتیں اور ان کی رہنمائی کرتیں۔حضرت بی بی عنایتؒ کی ساری زندگی دینی اور روحانی تبلیغ میں ہی گزری۔آپ کے روحانی اثاثے کی مالکہ آپ کی نواسی محترمہ زیتون بیگم آف سہار ہیں جبکہ آپ کی توجہ خاص اور پرورش کا ثمر الحاج راجہ بشیر احمد خان ہیں۔آپ نے خواتین کے لئے بیاہ شادیوں کے گیت اور لوریاں بھی لکھیں۔جن میں ذکر الٰہی اور نعت رسول ﷺ سے مزین دعائیں شامل کر کے ان گیتوں اور لوریوں کے حسن نغمگی کو ایک خاص انداز میں پیش کیا۔

تہذیب وتمدن، دین و مذہب، رسم و رواج، معاشرہ و ریاست، حکومت وحکمران، تعلیم و تربیت ایسے خارجی اورداخلی ادارے اور اصطلاحیں ہیں جن کا انسانی زندگی سے گہرا ربط ہے۔ کوئی انسان کتنا ہی سیکولر کیوں نہ ہو وہ اندر سے ایک عقیدے پر یقین ضرور رکھتا ہے اور حقیقت میں وہ اس عقیدے پر سختی سے کاربند ہونے اور اس کی تبلیغ میں مصروف عمل ہوکر دوسرے عقائد کی نفی کرتا ہے۔ تہذیب کے لغوی معنی کیا ہیں اس پر بحث لاحاصل ہے۔ تہذیب کا ظاہری اور باطنی مشاہدہ اور انسان کی زندگی پر اثرات نے جس طرح مجھے متاثر کیا اس کی طرف متوجہ ہونا میرے لئے ایک قدرتی امر ہے۔ تہذیب انسان کے ظاہر و باطن پر انتہائی گہرا اثر ڈالتی ہے اور وہ پیدائش سے موت تک تہذیبی دائرے ہی میں مقید رہتا اور عمل کرتا ہے۔ اسی تہذیب سے ایک تمدن پروان چڑھتا ہے ایک کلچر اور ثقافت وجود پذیر ہوتی ہے جس کے کچھ اپنے رسم ورواج ہوتے ہیں جو آگے چل کر معاشرے اور ریاست کے قوانین اور ضابطے مرتب کرتے ہیں۔ تہذیب وثقافت، معاشرے اور ریاست کی حفاظت کے لئے جہاں قوانین اور ضابطے ضروری ہیں وہیں معاشرتی روحانی ماحول کا سازگار ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ جس معاشرے اور ریاست سے تہذیبی اقدار کا خاتمہ ہوجائے۔ وہ معاشرہ اور ریاست محض خارجی قوت کے بل بوتے پر کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ضروری نہیں کہ ایک ملک کی داخلہ یا خارجہ پالیسی دوسرے ملک پر زیادہ اثر انداز ہو مگر یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت اور صداقت ہے کہ ایک مضبوط تہذیب دوسری تہذیب کو متاثر کرتی ہے اور آخر کار اسے اپنے اندر ضم کرلیتی ہے۔ ایک مضبوط تہذیب کا ملکی معاشی وسائل اور مادی قوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا چونکہ تہذیب کا تعلق معاشرتی اخلاقی روحانی قدروں اور رسم ورواج سے ہوتا ہے جسے کوئی مادی قوت یکسر ختم نہیں کرسکتی۔ آج کل جو کچھ مغربی معاشرے میں ہورہا ہے اور جس بے راہ روی کے دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ مغربی تہذیب کی حقیقت نہیں اور نہ ہی اسے مغربی ثقافت کہا جاسکتا ہے۔ یہ تہذیب اور ثقافت ایک مصنوعی خول ہے جسے تہذیب کے چہرے پر چڑھا دیا گیا تاکہ مشرق اور مغرب میں ایک واضح حد اور نمایاں تفریق نظر آئے ورنہ انسانی تہذیب میں کوئی خاص فرق ہوہی نہیں سکتا اور صرف رسم ورواج اور چند معاشرتی تبدیلیاں انسانی اخلاقی اور روحانی اقدار میں وسیع تر تفریق کا

باعث نہیں بن سکتیں۔ اثبات کا ثبوت مشترکہ انسانی اخلاقی قدریں اور روحانی منازل کی درجہ بندیاں ہیں۔ نیکی چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں وہ نیکی ہی کہلاتی ہے۔ اس کا دوسرا کوئی نام نہیں۔ جس طرح انسانوں کے دکھ درد، مسائل اور پریشانیاں، خوشیاں اور غم مشترک ہیں ویسے ہی اخلاقی اور روحانی درجات بھی مشترک اور ہم آہنگ ہیں۔

مغربی مصنوعی ثقافت حقیقتاً مذہب سے بغاوت اور روحانیت سے دوری کا باعث ہے۔ مذہب میں من گھڑت اصطلاحوں اور چرچ کی حکومتی مسائل میں مداخلت نے عام آدمی کو دین سے دور کر دیا تو چرچ براہ راست حکومتی تحویل میں آ گیا۔ مذہبی اور سیاسی اداروں کی باہم چپقلش اور کشمکش نے معاشرتی اقدار پر بھی اثر ڈالا اور لوگوں کو دین سے دور کر دیا تو مذہب انسان کا پرائیویٹ مسئلہ بن گیا جبکہ حکومتی اور سیاسی اداروں نے مذہب کو چرچ تک محدود کر دیا۔ لوگوں نے ضرورت کے مطابق مذہب کو اپنایا اور محض عقیدے کی حد تک ہی مذہب کو اپنانے میں آفیت سمجھی۔ مذہب سے دوری اور روحانیت سے بیگانگی نے جو ماحول پیدا کیا اس سے ایک نئی ثقافت نے جنم لیا جس نے جنسی بے راہ روی اور مادر پدر آزاد معاشرتی ماحول کو فروغ دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس آزادی اور بے راہ روی کی جو معاشرہ اور ریاست اجازت دیتا ہے وہ اسے خود پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی تبلیغ و ترویج کو اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ یورپ کے کسی بھی ملک میں جائیں لوگ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کے خواہاں نظر آتے ہیں اور ان کی تربیت خالصتاً روحانی اور دینی ماحول میں کرنے کی چاہت رکھتے ہیں۔ وہ خود اس آزاد ماحول سے بیزار ہیں اور پرانی قدروں کو یاد کرتے اور آہیں بھرتے نظر آتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کا آزاد معاشرتی اور جنسیاتی ماحول جسے خود امریکن اور اہل یورپ ناپسند کرتے ہیں ان کی زندگی کا محض ایک حصہ ہے جس کا ان کے معاشرتی اور تمدنی قوانین اور اصلاحات پر کوئی اثر نہیں۔ ان کا تعلیمی، عدالتی، معاشی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام فطری، اصلاحی، تعمیری اور دوررس نتائج کا حامل ہے، مگر افسوس کہ اہل مشرق، خاص کر ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھنے والے تارکین وطن یورپ کی ان نعمتوں سے کچھ حاصل کرنے کے بجائے اس کے آزاد جنسی اور معاشرتی ماحول کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جو اپنی کمزور تہذیبی اور ثقافتی تربیت اور دین و روحانیت سے بیگانگی کی وجہ سے یورپ کی مصنوعی ثقافت کو اپنانے میں ہی آفیت سمجھتے ہیں۔ ان تارکین وطن خاص کر یورپ میں پیدا

ہونے والے بچوں کی بڑی تعداد یورپ کی جیلوں میں لمبی سزائیں کاٹ رہی ہے جو کئی اقسام کے جرائم میں ملوث اور مرتکب ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ لوگ یا ان کے لواحقین ان بداعمالیوں پر شرمندہ نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان کے دیگر ساتھی بھی ایسے جرائم کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یورپ میں تارکین وطن کی نئی نسل نہ صرف اہل یورپ کیلئے دردسر بنتی جارہی ہے بلکہ ان کی کمزور تہذیبی تربیت ہمارے مشرقی معاشرتی ماحول اور ثقافتی اور دینی اقدار کی بدنامی کا بھی باعث ہے۔ یورپی مصنوعی تہذیب اور آزاد معاشرتی ماحول کی کشش سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے جس کا تعلق دینی شعائر پر مضبوطی سے قائم رہنا اور یورپ کی اچھی روایات کو اپنا کر انہیں اپنی تمدنی زندگی کا حصہ بنالینا ہے۔ وہ خاندان اور گھرانے جنہوں نے اپنی دینی روحانی اور تمدنی روایات پر سختی سے عمل کیا ان کے بچے یورپ کے آزاد معاشرتی ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس ماحول کا حصہ نہیں بنے۔ ان کے دل میں اپنی مادر دھرتی کی کشش ہمیشہ زندہ رہی اور ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی وہ اپنے وطن کی مٹی کی مہک سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

یورپ میں بسنے والے ایسے ہی چند گھرانوں میں ایک گھر الحاج راجہ بشیر احمد خان کا بھی ہے جو پچاس کی دہائی میں بسلسلہ روزگار انگلینڈ آئے اور تقریباً پچاس سال سے یہاں مقیم ہیں۔ الحاج راجہ بشیر احمد خان کے خاندان اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ کہ ایک آسودہ حال خاندان کی اکلوتی نرینہ اولاد ہوتے ہوئے بھی آپ کی پرورش خالصتاً دینی اور روحانی ماحول میں ہوئی۔ الحاج راجہ بشیر احمد خان کے والدین ایک ایسے روحانی سلسلہ سے منسلک تھے جس کا عمل مشاہداتی اور مجاہدانہ تھا۔ آپ کے والد ذیلدار سفید پوش راجہ سخی ولائت خان ایک مجاہد صفت درویش اور عوام کا دکھ درد رکھنے والے قائد تھے۔ آپ نے اپنی ساری دولت غرباً و مساکین کیلئے وقف کر رکھی تھی اور اپنے لئے سفید پوشی کا لقب ہی کافی سمجھا اور اسی تاج کو ساری زندگی اپنے سر پر سجائے رکھا۔

الحاج راجہ بشیر احمد خان کا خاندان انگلینڈ میں

الحاج راجہ بشیر احمد خان نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا اور کچھ عرصہ پی ڈبلیو ڈی میں بطور سب انجینئر کام کرتے رہے۔ پچاس کی دھائی میں آپ اپنے والد محترم سے اجازت لیکر انگلینڈ چلے آئے اور ابتدائی دور میں لندن کے قریب سٹوک آن ٹرنٹ کے قصبے میں ایک فاؤنڈری میں کام کرنے لگے چونکہ یہاں آپ کے علاقہ کے کچھ اور بھی تارکین وطن موجود تھے اور اسی فاؤنڈری میں کام کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ لوٹن شفٹ ہو گئے اور واکس حال میں کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد جب آپ کی بیگم انگلینڈ آئیں تو آپ نے فیکٹری سے کام چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا جس میں آپ کو کافی آمدنی ہوئی آپ نے اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور توجہ دی اور انہیں دین اور وطن کی محبت سے بہرہ ور کرتے رہے۔ آپ کا گھریلو ماحول انتہائی سادہ اور مذہبی تھا چونکہ دونوں میاں بیوی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلسلہ اویسیہ سے بھی منسلک تھے۔ آپ کے گھر کے روحانی ماحول اور سلسلہ عالیہ اویسیہ سے وابستگی کا اثر آپ کے بچوں پر بھی ہوا جس کی وجہ سے یورپ کے رنگین اور آزاد ماحول کا ذرہ بھر اثر آپ کی اولاد پر نہ ہوا۔ آپ اپنے گھر پر محفل درود پاک کا اکثر انعقاد کرتے جس میں آپ کے بچوں کے علاوہ ان کے دوست بھی مدعو ہوتے اور اس پاک محفل کی برکتوں سے فیض یاب ہوتے۔ آپ کے بچوں نے دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ دی اور ابتدائی عمر ہی میں قرآن پاک ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھا۔

الحاج راجہ بشیر احمد خان اور ان کی زوجہ محترمہ کو ہمیشہ ہی یہ احساس رہا کہ بچوں پر توجہ نہ دینے اور انہیں دین کے عملی پہلوؤں سے روشناس نہ کروانے کا نتیجہ انہیں یورپ کے آلودہ معاشرتی اور مصنوعی ماحول کے سپرد کرنا ہوگا۔ یہ احساس یورپ میں بسنے والے اچھے خاندانوں اور ذمہ دار والدین کے لئے اس لئے بھی ضروری ہے چونکہ یہاں کا ماحول اور میڈیا بچوں کے ذہنوں پر نہایت ہی سرعت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر والدین بچوں سے ذرہ بھر غافل رہیں تو میڈیا انہیں اپنی لپیٹ میں لیکر اپنے انداز سے ان کی تربیت کرتا ہے۔ وہ بچے جنہیں والدین ماحول کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داریوں سے غافل

رہتے ہیں ایسے بچے نہ تو یورپین بنتے ہیں اور نہ ہی وہ ایشیائی رہتے ہیں۔ یہ بچے نہ صرف اپنے ایشیائی والدین کے لئے شرمندگی اور ندامت کا باعث ہیں بلکہ مقامی یورپین حکومتوں کے لئے بھی مسائل پیدا کررہے ہیں۔ اگر ہماری ثقافت مضبوط ہوتی ہم اپنے دین کی سمجھ رکھتے اور اسے یورپ میں رہ کر اپناتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اہل یورپ ہماری اسلامی روایات اور کلچر کو نہ اپناتے۔ آج افغان دنیا کی سب سے غریب اور مفلوک الحال قوم ہے۔ قحط بیماریوں اور مسلسل بائیس سالہ جنگ نے افغان قوم کو ساری دنیا میں منتشر کر دیا ہے مگر ان کا مضبوط تمدن اور ثقافت اپنی جگہ نہ صرف قائم ہے بلکہ جہاں افغانی جاتا ہے وہ دوسروں کے لئے توجہ کا باعث بن جاتا ہے۔ سارے یورپ اور امریکہ میں پھیلے افغان ہوٹل، کیفے ٹیریا، کارپٹ سنٹر اور انٹیک شاپس اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ قوم کبھی بھی ثقافتی اور تمدنی لحاظ سے شکست خوردہ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی دنیا کی کوئی دوسری ثقافت اور تمدن انہیں اپنے اندر جذب کرسکتا ہے۔ افغان دنیا کے کسی کونے میں ہو اور جو بھی کاروبار کرتا ہو اسے افغانستان کی مٹی سے محبت رہتی ہے۔ وہ اپنی زبان بولتا ہے پانچ وقت نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے۔ اور جب بھی وقت ملے وہ افغانستان کی سرزمین کو چومنے ضرور جاتا ہے چاہے وہاں ڈیزی کٹر اور کلسٹر بم برس رہے ہوں کیمیائی ہتھیار چل رہے ہوں یا پھر قدم قدم پر بارودی سرنگیں بچھی ہوں۔ افغانی مہاجر پڑوسی ایران میں ہوں پاکستان میں یا یورپ اور امریکہ میں۔ جہاں پانچ دس گھر اکھٹے ہوتے ہیں اپنے بچوں کیلئے ایک افغان سکول کھول کر افغانستان کے پچاس سالہ پرانے نصاب پر مبنی سلسلہ تعلیم شروع کر دیتے ہیں۔ بسلسلہ تعلیم کچھ عرصہ قبل راقم کو جرمنی جانے کا اتفاق ہوا جہاں بے شمار افغانوں کو چھوٹے چھوٹے مگر صاف ستھرے اور باعزت کاروبار کرتے دیکھ کر حیرت ہوئی چونکہ جرمنی اور فرانس میں ایشیائی تارکین وطن کی ایسی حالت نہیں جیسے امریکہ یا پھر برطانیہ میں ہے۔ اپنے مختصر قیام کے دوران جب راقم نے افغان باشندوں سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ جرمن قوم افغانوں کی ویسے ہی عزت اور احترام کرتی ہے جیسے ترک پاکستانیوں کی۔ جرمن افغانوں کی روایات، جرأت اور غیر تمندی کے معترف ہیں اور ان کے ثقافتی اور تمدنی اقدار کو جرمن قوم کی ثقافتی روایات کے قریب تر سمجھتے ہیں۔

گو کہ ہمارے معاشی حالات افغانوں سے بدرجہا بہتر ہیں اور ہماری تہذیب و ثقافت پر ترکی اور ہندی کلچر کے علاوہ افغانی اور ایرانی ثقافت کا بھی اثر ہے۔ مگر افسوس کہ کم علمی اور روایات سے

دوری کی بنأ پر یورپ میں بسنے والے اکثر پاکستانی خاندان اپنی پہچان ہی گنوا بیٹھے ہیں۔ الحاج راجہ بشیر احمد خان کے خاندان کی طرح بے شمار ایسے خاندان بھی یورپ میں آباد ہیں جنہیں نہ صرف اپنی قومی اور خاندانی روایات کا احساس ہے بلکہ انہیں اسلامی تہذیب اور تعلیم کی طرف توجہ کا بھی خیال ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے احساس اور بیداری کی وجہ سے آج یورپ میں اسلامی روایات تمامتر مادی رکاوٹوں کے باوجود مغربی اقوام کو متاثر کر رہی ہیں اور اہل مغرب اسلامی ضابطہ حیات کو جہاں اپنے مادی نظام کے لئے ایک خطرہ سمجھ رہے ہیں وہی وہ اس نظام کی آفاقی خوبیوں کو اپنانے کا بھی سوچ رہے ہیں۔ اسلام کی یہ خاموش تبلیغ کرنے والے نہ تو علماً کرام ہیں اور نہ ہی یورپ میں پھیلے جدید مدرسے اور اسلامک سنٹر۔ اسلامک سنٹر اور مدرسے جہاں تبلیغ کا کام کرتے ہیں وہیں کچھ قباعتیں اور تفرقے پھیلانے کا باعث بھی ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ جو جو نفرتیں اور کدورتیں ہم نے اپنی سرزمین پر پال رکھی ہیں انہیں ہمارے قائد، پیر، مبلغ اور سیاستدان بیرون ملک بھی درآمد کر رہے ہیں۔ اسلامک سنٹر گروہی سیاست اور برادری ازم کے گڑ بن چکے ہیں۔ جہاں قبضہ گروپوں میں ہونے والی جنگ سے یہاں کی مقامی حکومتیں بھی لطف اندوز ہوتی ہیں۔ فرقہ واریت اور مسلکیت کی جتنی بیماریاں اہل وطن کو لگی ہوئی ہیں ان کی ہر جدید شکل یورپ میں بھی موجود ہے مگر وہ لوگ اور گھرانے جوان امراض سے بچے ہوئے ہیں اور صرف اللہ کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں ان کی زندگیوں سے متاثر ہوکر اہل یورپ دین اسلام کی حقیقی روح کو پہچان رہے ہیں اور ان کی برکت اور عظمت کے قائل بھی ہیں۔ ایسی ہی شخصیات میں جناب شبیر احمد شاہینؒ آف بلیک برن مرحوم و مغفور کا مبارک نام بھی تھا جنہوں نے تصوف اور تزکیہ کی حقیقت سے لوگوں کو روشناس کروایا اور ہزاروں دلوں کو کئی سالوں تک مادیت کی آلائشوں سے پاک کرتے رہے۔ مرحوم شبیر احمد شاہینؒ کی رحلت کے بعد جناب راجہ بشیر احمد خان نے آپ کے روحانی مرکز جو کہ بلیک برن برطانیہ میں قائم ہے کا اقتدار سنبھالا اور سلسلہ عالیہ اویسیہ کے طریقے اور قائدے کے مطابق تبلیغ دین کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ یہ طریقہ تبلیغ ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی امور کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے اور تزکیہ نفس اور مجاہدہ کی تلقین کرتا ہے۔ تبلیغ دین کا یہ سلسلہ سادگی، ریاضت اور قلبی فکر کا آئینہ دار ہے اس لئے طالب دین کیلئے ضروری ہے کہ وہ ظاہری نمود و نمائش اور مادی آلائشوں سے پرہیز کرے۔ اس سلسلہ میں فرقہ واریت اور مسلکیت کی بھی گنجائش نہیں چونکہ جو شخص اس سلسلہ کی وساطت

سے درود اویسی کا ذکر کرتا ہے اسے اپنے ہی من سے رہنمائی حاصل ہوئی ہے۔ جوں جوں طالب من کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے اس کے درجات بلند ہوتے ہیں جس کا مشاہدہ کھلی اور بند آنکھوں سے جاری ہوتا ہے۔ اس کی سوچ اور عمل میں یکسانیت آجاتی ہے اور خوف خدا کا ہالہ اسے اپنی لپیٹ میں لیکر اسے انسانیت کے اعلیٰ مقام پر کھڑا کر دیتا ہے۔ جب ایک عام انسان جو اپنے ظاہری رتبے اور پیشے کے ساتھ انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو تو اس کے اردگرد بسنے اور رہنے والے اس کی ذات سے متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

اسی سلسلہ کا ایک مرکز الحاج راجہ بشیر احمد خان کا گھر بھی ہے جو کہ برطانیہ کے شہر لوٹن میں واقع ہے۔ اس گھر کے سبھی افراد اپنی اپنی قلبی استطاعت کے مطابق سلسلہ عالیہ کی خدمت میں کوشاں رہتے ہیں اور ورود اویسی کے عامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس گھر میں کثرت سے حضور پرنور ﷺ پر درود شریف بھیجا جائے وہاں آپ ﷺ کی خصوصی نظر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی بخشش کے دیگر وسائل بھی پیدا کرتے ہیں۔

الحاج راجہ بشیر احمد خان نے جہاں اپنی اولاد کی ظاہری تعلیم پر توجہ دی وہی گھر کے ماحول اور سلسلہ عالیہ اویسّہ سے وابستگی کی وجہ سے آپ کی بڑی بیٹی اور بیٹے جاوید اقبال کو اس سلسلہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا چونکہ آپ کے یہ دونوں بچے حضرت قبلہ صوفی محمد نور الدینؒ اویّسی امینی کشمیری کے بہت قریب تھے اور حضرت قبلہ پیر صاحبؒ ان سے بے حد پیار کرتے تھے۔ الحاج راجہ بشیر احمد خان کی بڑی بیٹی جن کی شادی آپ کے بھانجے سے ہوئی جو کہ پاک فوج میں ملازم ہیں۔ آپ کی یہ بیٹی آپ کے گھر کی واحد فرد ہیں جن کا مستقل قیام پاکستان میں ہے۔ باقی بہن بھائیوں کی نسبت جاوید کو اپنی بڑی بہن سے بے حد پیار اور انس تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنی بہن کے قریب رہا اور ایک دوسرے سے جدائی دونوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی۔ جاوید کی تعلیم کی وجہ سے اس کے لئے پاکستان آنا ممکن نہ تھا اس لئے ہر سال موسم گرما کی چھٹیوں میں جاوید کی بہن انگلینڈ جاتی اور اس طرح بہن بھائی یہ شب و روز اکٹھے گزارتے اور وطن اور اہل وطن کے متعلق خوب باتیں ہوتیں۔ جاوید اپنی بہن سے افواج پاکستان کے متعلق بھی معلومات لیتا اور ہمیشہ تحریک پاکستان، افواج پاکستان، 1965ء، 1971ء کی جنگوں اور تحریک آزادی کشمیر کے متعلق کتابوں کی فرمائش کرتا۔ اسے غزوات رسول ﷺ اور دیگر اسلامی تحریکوں اور جنگوں کے متعلق پڑھنے کا بھی شوق ہوا تو اسلامک سنٹر لوٹن نے اس کی یہ پیاس بھی بجھائی۔

ینگ مسلم سوسائٹی

جماعت اسلامی کے تربیتی پروگراموں کا ایک سلسلہ ینگ مسلم تحریک کا انگلینڈ میں آغاز تھا۔ ابتدائی آیام میں اس تحریک نے بہت اچھا کام کیا اور نو جوانوں کی تربیت پر بھرپور توجہ دی مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ تحریک اپنا اصل وجود قائم نہ رکھ سکی۔ میں اس تحریک سے وابستہ جن نو جوانوں سے ملا ان کی صحبت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ ظاہر سے باطن میں منتقل ہوگئی ہے۔ اس تحریک نے جتنے شہید اور غازی پیدا کئے ان کے عمل اور کردار کی خوشبو اس تحریک کی روح بن گئی ہے جو غیر محسوس انداز میں اپنا اثر دکھا رہی ہے اور نو جوانوں کو عملی میدان کی طرف کھینچ رہی ہے۔

جماعت اسلامی ضلع میر پور آزاد کشمیر کے سابق نائب امیر محترم ایوب مسلم جو کہ جانے مانے مجاہد لیڈر اور سوشل ورکر ہیں کے متعلق بعض اصحاب کی رائے ہے کہ ان کی کوششوں سے یہ تحریک چلی اور پھر جناب ایوب مسلم کی آزاد کشمیر منتقلی اور جہاد کشمیر سے عملی وابستگی کی وجہ سے تحریک اپنا اصل وجود برقرار نہ رکھ سکی۔ اس تحریک سے متعلق جو معلومات راقم کو ملیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریک اگر منظم طریقے سے جاری رہتی اور مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ تعصب اور مسلکی تنگ نظری اس کی راہ میں حائل نہ ہوتی تو تحریک یورپ میں اسلامی تشخص اور کلچر کو جس انداز سے متعارف کروا رہی تھی اس سے ایک اسلامی انقلاب برپا ہوتا اور اہل یورپ اپنی مادی دولت اور ظاہری حسن اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی خوبصورتی سے بھی مالا مال ہو جاتے۔ مگر افسوس کہ ینگ مسلم تحریک اپنے اغراض و مقاصد پورے نہ کر سکی اور اس پر بھی روایتی دقیانوسی لیڈروں نے شب خون مارا اور اسے برادری ازم اور مسلکی تنگ نظری کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ظاہر ہے کہ جو تحریک خود روحانی اقدار و اوصاف سے خالی ہو اس کا وجود زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید جس انداز سے غزوات رسول ﷺ اور مسلم تحریکوں پر گفتگو کرتے اس سے سننے والے پر بڑا گہرا اثر ہوتا۔ ہم لوگ اکثر ان سے پوچھتے کہ آپ انگلینڈ میں پیدا ہوئے وہی تعلیم حاصل کی اور جس طرح آپ غزوات رسول ﷺ اور دیگر اسلامی تحریکوں کا علم رکھتے ہیں اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے یورپ میں نہیں بلکہ کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ سن کر شہید کا سینہ تن جاتا اور وہ بڑے فخر سے کہتے۔

I am a Young Muslim جب ہم نے ان سے ینگ مسلم کے متعلق پوچھا تو فرمانے لگے میں اپنی بہن محترمہ خورشید بیگم کے ہمراہ چونلی بوائز ہائی سکول سے گھر آرہا تھا کہ راستے میں بنگالی لڑکوں اور لڑکیوں نے ہمیں روک لیا۔ پہلے انہوں نے مجھے کراٹے میں بلیک بیلٹ ملنے پر مبارک باد دی اور بتایا کہ ہم بنگالی مسلمان ہیں اور جب کوئی مسلمان یورپ کی سرزمین پر اچھا کارنامہ سرانجام دیتا ہے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ پھر ان بنگالی طلباء اور طالبات نے میرے فٹ بال کھیلنے کے انداز کی تعریف کی اور دعائیں دی کہ میں سکول کا بہترین فٹ بالر بنوں۔ اس کے بعد جب بھی سکول میں فٹ بال میچ ہوتا یہ گروپ مجھے داد دینے ضرور آتا اور ان کی نیک خواہشات سے میں سکول کا بہترین فٹ بالر بن گیا جس کا مجھے ایوارڈ بھی ملا۔ بنگالی دوستوں سے میری ایک دوبار جامع مسجد لوٹن میں ملاقات ہوئی جہاں میں امی جان کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے جاتا تھا۔ مجھے نماز جمعہ پڑھتے دیکھ کر یہ گروپ بہت خوش ہوا اور انہوں نے مجھے ینگ مسلم بننے کی ترغیب دی۔ بنگالی دوستوں کی محبت اور دین سے لگاؤ مجھے ینگ مسلم سنٹر لے گیا جو کہ لوٹن میں واقعہ ایک گھر تھا۔ اس گھر میں چند لوگ مقیم تھے جبکہ دیگر استاد اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر یہاں درس دینے آتے اور نوجوانوں کی تربیت کرتے۔ اس مسلم سنٹر میں آنے کے اوقات بڑے ہی سہل تھے جس سے کسی پر بوجھ نہ پڑتا۔ پہلی نشست ظہر سے عصر تک ہوتی اور دوسری مغرب سے عشاءٔ تک۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ کس نشست میں آئے اگر کوئی چاہے تو ظہر سے عشاءٔ تک بیٹھے درس قرآن و حدیث سنے۔ تاریخ اسلام اور تحاریک اسلامی پر گفتگو کرے۔ اس اسلامک سنٹر میں پاکستان، بھارت، بنگلادیش، عرب اور افریقہ سے سکالر بھی آتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ گو

کہ یہ گھر بہت چھوٹا سا تھا مگر جس انداز سے یہاں نوجوانوں کی تربیت ہوتی اس سے یوں لگتا کہ چند سالوں کے اندر ہی یورپ میں مقیم مسلمان ایک تحریک بن کر ایک ایسا خاموش روحانی انقلاب لائیں گے کہ اہل یورپ مسلمانوں کی یورپ میں آمد کو اپنے لئے باعث نجات سمجھیں گے۔

یہ جگہ عملی تحریک کا مرکز تھی۔ ہر شخص اپنے عمل سے ایک دوسرے کو متاثر کرتا اور تربیت اور اصلاح میں رہنمائی کا باعث بنتا۔ ہر نشست کا آغاز تلاوت کلام پاک اور ترجمہ سے ہوتا اور ہر طالب علم کی خواہش ہوتی کہ وہ تلاوت کلام پاک پیش کرے۔ پھر درس قرآن اور حدیث ہوتا اور جن طلباً نے ناظرہ قرآن پڑھنا ہوتا یا پھر اپنا تلفظ درست کرنا ہوتا وہ علیٰحدہ ٹولیوں میں بیٹھ کر دھیمی آواز میں درس لیتے۔ باقی طالب علم الگ بیٹھ کر پہلے حالات حاضرہ پر مفصل گفتگو کرتے جن میں تحریک آزادی کشمیر، تحریک آزادی فلسطین، نیشنل مورد فرنٹ اور جہاد افغانستان سرفہرست ہوتے۔ اسی گفتگو کے دوران استاد بڑی ہی شفقت سے حالیہ واقعات کا غزوات رسول ﷺ اور ماضی کی اسلامی تحریکوں سے موازنہ پیش کرتے اور حالیہ تحریکوں میں جہاں جہاں خامیاں نظر آتیں ان کی نشاندہی کرتے اور ان کے اسلامی روح سے بیگانگی کی وجہ بتلاتے۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ بڑے ہی خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں چلتا۔ بعض دوست خاص تیاری کر کے آتے اور اسلامی واقعات عمدہ طریقے سے بیان کرتے۔ بعض اوقات یہ بیان اتنا موثر ہوتا کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا گویا ہم یہ سب واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ان معرکوں میں خود بھی شامل ہیں۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید فرماتے کہ ینگ مسلم تحریک نے جو درس مجھے دیا میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ یہ تحریک مجھے یورپ سے پاکستان لے آئی اور مجھے اپنی (آپا) بہن کے قریب رہنے کا موقع دیا۔

تارکین وطن کو جونسل یورپ میں پیدا ہوئی اسے ہم صرف دوحصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اوّلین وہ نوجوان ہیں جو مکمل طور پر یورپ زدہ ہیں اور انہیں دین و دنیا کی ہوش نہیں۔ دوسری جماعت اُن تارکین وطن کی ہے جو پیدا تو یورپ میں ہوئے مگر والدین کی توجہ اور وطن سے محبت انہیں دوسری سمت لے گئی جہاں دین کو اوّلیت دی جاتی ہے اور دنیا کو دین پر قربان کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ ان دو طبقوں کے علاوہ نوجوانوں کا کوئی تیسرا طبقہ یہاں نہیں جو درمیانہ رول ادا کرنے والا اور منافقت زدہ ہو۔ میں ان دو طبقات کو بھی اچھا سمجھتا ہوں اور اسے یورپ کے ماحول کی نعمت قرار دیتا ہوں۔ پہلا طبقہ اپنی ذات کا دشمن ہے اور اس کا بھٹکنا ایک فطری عمل ہے۔ یہ طبقہ ایسے والدین کا پیدا کردہ ہے جنہوں نے پیسہ کمانے پر تو زور دیا مگر اولاد کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دی۔ راقم نے اس سلسلہ میں جو تحقیق کی اس سے ظاہر ہوا کہ یہ والدین بھی زیادہ قصوروار نہیں چونکہ ان میں ننانوے فیصد خود ان پڑھ تھے اور انہیں دین کی ذرہ بھر سمجھ نہیں تھی۔ یہ لوگ پیسہ کمانے کا مشن لیکر آئے تاکہ وطن میں کروڑ پتی کہلاسکیں۔ یہ طبقہ خود احساس محرومی اور کمتری کا شکار تھا اور یہی احساس محرومی انہوں نے اپنے بچوں میں بھی منتقل کر دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ یورپ کے بہتر تعلیمی نظام سے فائدہ اٹھاتے اور اپنے بچوں کو علم اور ہنر سے لیس کر کے وطن کی خدمت کرتے انہوں نے بچوں کو پیسہ کمانے کا ذریعہ بنایا اور انہیں ایسی ڈگر پر ڈال دیا جس سے اب واپسی ممکن نہیں۔ گو کہ یہ طبقہ ہر جائز اور ناجائز حربے سے دولت سمیٹ رہا ہے اور اسے ایسے ہی طریقوں سے خرچ بھی کر رہا ہے مگر اس طریق سے نہ تو ملک کو کوئی فائدے ہوا اور نہ ہی قومی وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ دولت کے انبار لگانے اور اسے احساس محرومی اور احساس کمتری کو مٹانے کی خاطر جس طرح یہ دولت خرچ ہوتی ہے اس سے اس طبقہ کا اخلاقی قد بھی نہیں بڑھا اور نہ ہی یہ لوگ معاشرے کی ترقی کے لئے کوئی فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

ینگ مسلم تنظیم نے ابتدأ میں جو کام کیا اور دین کی سمجھ رکھنے والے نوجوانوں کی جس انداز سے تربیت کی اس کی گونج افغانستان، کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا کے جنگی محاذوں سے سنائی دینے لگی۔ یورپ کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے ان نوجوانوں نے یورپ کی آسائشوں کی طرف توجہ دینے اور

مادی دولت کمانے کے بجائے اپنی جانوں کا سودا اللہ سے کرلیا اور ایک بڑی تعداد میدان عمل کی طرف نکل گئی۔ یورپ کی درسگاہوں سے علم حاصل کرکے میدان عمل میں آنے والے ان نوجوانوں نے نہ صرف اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کیں بلکہ ان کے اس عمل نے وطن عزیز میں بسنے والے لاکھوں نوجوانوں کو اس راہ پر چلنے کی ترغیب دی۔ یورپ سے نکلنے والا ینگ مسلم کا پہلا دستہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جنہوں نے یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور وہ بے شمار منافع بخش پیشوں سے منسلک تھے۔ ان میں کچھ ڈاکٹر اور انجینئر تھے تو کچھ بزنس مین اور ہنرمند بھی۔ یہ لوگ دولت کو دین پر قربان کرکے جہاد افغانستان میں شامل ہوئے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک نئی راہ متعین کر گئے۔ ان میں سے کچھ جو اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ان کی بہادری اور جرأت کے واقعات سنانے والے غازی جب واپس لوٹے تو نئی جماعت ان کی جگہ لینے کو تیار بیٹھی تھی۔ یوں شہادتوں اور عظمتوں کا یہ سلسلہ جاری ہوگیا۔ ینگ مسلم تنظیم بظاہر تو ختم ہوگئی مگر اس کی خوشبو ہر سمت پھیل گئی۔ الفاظ نے معنی کا روپ دھار لیا اور یورپ کی پرلطف مادی زندگی شاہینوں اور شہبازوں کو اپنی جانب کھینچنے میں ناکام ہوگئی۔ افغانستان کے بعد کشمیر کا محاذ کھلا تو درجنوں مجاہد مادر وطن کی جانب چل پڑے اور شہادتوں کی انمٹ داستانیں رقم کرتے راہ حق میں جانیں قربان کرنے لگے۔ اس جماعت کا ایک رکن کیپٹن جاوید اقبال شہید بھی ہے جو اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرتے ہی اس راہ پر چل نکلا اور آخر کار اپنی منزل مراد پانے میں کامیاب ہوگیا۔

پاکستان میں آمد

جاوید اقبال شہید اپنے سکول کا اچھا طالب علم ہی نہیں بلکہ بہترین کھلاڑی بھی تھا۔ فٹ بال کے میدان کا یہ ہیرو اپنی ذہنی اور روحانی تربیت اور ینگ مسلم تنظیم کے مجاہدوں کی رفاقت کی وجہ سے اپنے من میں ایک نئی دنیا بسا رہا تھا۔ سکول کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے والدین اور چھوٹی بہن کے ہمراہ پاکستان آیا۔ بظاہر مقصد چھٹیاں گزارنا تھا مگر وہ اپنے دل میں کچھ اور ہی ارادہ لے کر آیا تھا۔ پاکستان پہنچتے ہی اس نے اپنے دوستوں سے رابطہ کیا تا کہ جہاد افغانستان میں شامل ہو سکے۔ اس سلسلے میں اس کی دوڑ دھوپ دیکھتے ہوئے اس کی بڑی بہن اسے اپنے ساتھ لے گئیں اور اسے ترغیب دی کہ اگر جہاد میں حصہ لینا ہے تو اس کا بہترین طریقہ پاکستان آرمی میں شمولیت ہے۔ انہوں نے جاوید کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ مجاہدین کے ساتھ شمولیت بھی ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل ہے مگر تربیت کے بغیر میدان جنگ میں جانا سود مند نہیں۔ پھر تمہیں سوائے انگریزی کے دوسری زبان بھی نہیں آتی جبکہ تمہارے وہ ساتھی جو پہلے جہاد میں حصہ لے چکے ہیں اب یہاں نہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم پاکستان آرمی میں شامل ہونے کے لئے امتحان پاس کرو یا پھر اپنے دوستوں کا انتظار کرو اور ان کی پاکستان آمد پر ان کے ہمراہ جاؤ۔ کچھ عرصہ بہن کے ساتھ رہنے اور عسکری زندگی سے متعارف ہونے کے بعد نوجوان جاوید نے پاکستان آرمی میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں ابتدائی امتحانات بڑی آسانی سے پاس کر کے ۸۹ پی ایم اے لانگ کورس میں شمولیت اختیار کی۔ ابتداً میں جاوید کی بڑی بہن جو خود آرمی آفیسر کی بیگم تھیں اور دیگر اہل خانہ کا خیال تھا کہ فوج کی سخت تربیت اور کٹھن زندگی سے جلد اکتا کر جاوید خود ہی واپس آ جائے گا۔ انگلینڈ میں جاوید کے دوست اور دیگر رشتہ دار بھی اسی اُمید میں تھے کہ وہ جلد لوٹ آئے گا اور پھر سے انگلینڈ ہی میں سلسلہ تعلیم جاری رکھے گا مگر جاوید نے جو اپنی دھن کا پکا تھا اور انگلینڈ سے روانگی کے وقت ایک مشن لے کر آیا تھا نے فوجی زندگی کو کچھ ایسے انداز سے اپنایا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تربیت کے دوران جاوید ہمیشہ نمایاں رہا۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ وہ کھیل کے میدان میں بھی سب سے آگے رہا اور اکیڈمی سے فٹ بال کلر اور کھیلوں کے کئی

میڈل حاصل کئے۔ جاوید کی نمایاں کارکردگی دیکھتے ہوئے اس کا نام بیرون ملک بھیجے جانے والے کیڈٹوں کی فہرست میں بھی شامل کیا گیا اور یوں تربیت کے دوران اسے سارے ملک کے اہم اداروں اور تربیت گاہوں میں جانے کا موقع ملا۔ اس مشاہداتی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ اپنی بہن سے اکثر کہتا کہ مجھے اللہ نے سارا ملک دکھانے کا انوکھا انتظام کیا ہے۔ اس مشاہداتی دورے کے بعد جب حتمی چناؤ کے لئے انٹرویو ہوا تو جاوید نے اپنے کمانڈر کو یہ کہہ کر حیران کردیا کہ جناب میں بیرون ملک تربیت کا خواہش مند ہی نہیں ہوں۔ میں نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں پلا ہوں۔ اگر سینڈھرسٹ میں جانے کا شوق ہوتا تو میں آسانی سے برٹش آرمی میں شمولیت اختیار کرتا۔ میں یہاں ہی رہنا چاہتا ہوں مجھے اس دھرتی سے خوشبو آتی ہے۔ میں اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ جاوید کے ان جذبات کی قدر کرتے ہوئے اس کے اعلیٰ افسر نے اسے گلے لگایا اور بعد میں اس کے نام خط لکھ کر اسے شاباش دی۔

ملٹری اکیڈمی میں تربیت کے دوران اس کی کارکردگی کی بناً پر جاوید کو اورنگزیب کمپنی کا سینئر انڈر آفیسر بنایا گیا اور دو سال کی تربیت کے بعد وہ اپنے کورس میں اچھی پوزیشن لے کر پاس آؤٹ ہوا۔ تربیت کے دوران جاوید اکثر ایبٹ آباد میں قبلہ صوفی نورالدین صاحبؒ سے ملتا اور ان کی مجلس سے روحانی فیض حاصل کرتا۔ تربیت کے دوران ایک روز جاوید قبلہ کے ہاں موجود تھا کہ کسی نے کہا کہ جناب دعا کریں یہ نوجوان آگے چل کر جرنیل بنے۔ پتہ نہیں یہ کون سا لمحہ تھا اور خدا کا ولیؒ روحانیت کے کس مقام پر تھا کہ قبلہ نے یک دم جاوید کی طرف دیکھا اور فرمایا "جرنیلی معمولی چیز ہے اس کے مقدر میں اس سے بڑھ کر اعلیٰ مقام ہے" بے شک آپ کی پیشن گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی اور جاوید نے وہ مقام پایا جس کی خواہش انبیاؑ نے کی۔ اس نے زندگی کی وہ لذت پائی جس کا اظہار خالد بن ولیدؓ جیسے جرنیلوں نے بستر مرگ پر کیا۔ بھلا شہادت سے بڑھ کر کون سا مقام ہوسکتا ہے۔ تربیت کے دوران وہ چھٹیاں اپنے والدین کے ہمراہ انگلینڈ میں گزارتا اور اپنی خوشی کا اظہار کرتا کہ اب وہ اپنی آپا (بڑی بہن) کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو کیڈٹ شپ کے قصے سناتا اور انہیں پاکستان آنے اور فوج میں شامل ہونے کی ترغیب دیتا۔ وہ اکثر کہتا کہ ہماری فوج سراپا جہاد ہے اور ہر لمحے میدان جنگ میں ہے۔ تربیت کے دوران جب جاوید نے اپنی برطانوی شہریت ختم کرنے کی درخواست برطانوی سفارت خانے کو بھجوائی تو سفارت خانے کی طرف سے جواب ملا کہ آپ اپنا برطانوی پاسپورٹ بھی چاہئیں تو جمع

کروادیں۔ جاوید کا پاسپورٹ گاؤں میں اس کے ماموں کے پاس تھا۔ جاوید نے اپنے ماموں کو خط لکھا کہ پاسپورٹ اکیڈمی میں اس کے پلاٹون کمانڈر کے نام رجسٹری کردیں تاکہ وہ سفارت خانے کو واپس کردیں۔ جاوید کے ماموں نے پاسپورٹ بھجوایا تو پلاٹون کمانڈر کو پاسپورٹ کے بجائے ایک کاپی ملی جبکہ جاوید کا برٹش پاسپورٹ کسی نے نکال لیا۔ پلاٹوں کمانڈر نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ محکمہ ڈاک کے کسی ملازم نے یہ حرکت کی ہے جس پر محکمہ ڈاک نے کیڈٹ جاوید اقبال کے ماموں کو لکھا کہ آپ ہمارے عملے کے خلاف تحقیقات کی درخواست دیں تاکہ متعلقہ آدمی کے خلاف کاروائی کی جائے۔ گو کہ پاسپورٹ چرانا ایک جرم تھا مگر جاوید نے اسے بھی نیکی کے انداز میں لیا۔ ماموں نے جب درخواست دینا چاہی تو جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا ماموں جی آپ کو کیا گارنٹی ہے کہ اصل مجرم ہی پکڑا جائے گا۔ اگر پکڑا بھی گیا تو پاسپورٹ نہیں ملے گا چونکہ برٹش پاسپورٹ پر اب تک ایک جاوید یورپ یا پھر امریکہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے خاندان کو خوشحال بنانے کیلئے جتن کر رہا ہوگا۔ آپ کو کیا پتہ اس کے کتنے ارمان ہوں گے وہ کتنے لوگوں کا کفیل ہوگا۔ ہم اس جرم کو نیکی میں بدلتے ہیں اور اس معاملہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اس شخص کے لئے دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں رہے خوشحال رہے، رزق حلال کمائے اور اس کا خاندان خوشحالی کی زندگی گزارے۔ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ ویسے بھی سفارت خانے نے رائے دی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو پاسپورٹ جمع کروا دیں۔ اصل چیز نیشنلٹی تھی وہ میں نے ختم کروادی ہے۔ پاسپورٹ کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا کہ میں تو کسی خاص مقصد کے لئے ہوں اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو ایک جاوید اس دنیا میں ہوگا میں اس جاوید کی لمبی عمر کے لئے دعا کرتا ہوں۔ کیپٹن جاوید کی سوچ بڑی ہی گہری اور مثبت تھی۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو مثبت انداز میں دیکھتا۔ کسی کی دل شکنی اور پریشانی برداشت نہ کرتا۔ وہ ہر کسی کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا۔

کاکول میں رہتے ہوئے جاوید نے اپنی نیشنلٹی ختم کروانے کے بعد پاکستانی پاسپورٹ بنوایا اور جب بھی انگلینڈ اپنے والدین سے ملنے گیا اسی پاکستانی پاسپورٹ پر ویزہ لگوا کر گیا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ۸۹ پی ایم اے لانگ کورس کی دوسالہ تربیت اختتام کو پہنچی تو اکیڈمی میں زیر تربیت کیڈٹوں کی زندگی کا وہ مرحلہ آن پہنچا جس کا انہیں دو سال سے انتظار تھا۔ جس امید پر انہوں نے زندگی کا سب سے مشکل وقت یعنی اکیڈمی کی سخت ترین تربیت کا ایک ایک لمحہ جو برسوں پر محیط ہوتا گزارا تھا۔ یہ مرحلہ فوجی

یونٹ اور رجمنٹ کا آلاٹ ہونا اور پاسنگ آؤٹ کا مرحلہ تھا۔ جاوید کا شمار اپنے کورس کے ان چند کیڈٹوں میں ہوتا تھا جو اپنے کورس کے لیڈر تھے اس لئے ہر پلاٹون کمانڈر کی خواہش تھی کہ جاوید اس کی یونٹ میں جائے۔ وہ کئی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ ایک اچھا سپورٹس مین، اچھا مقرر، سمارٹ کیڈٹ اور تعلیمی قابلیت سے مالا مال نوجوان تھا۔ اس دور کے ایک پلاٹون کمانڈر جناب میجر فاروق احمد قاضی جن کا تعلق پنجاب رجمنٹ سے ہے نے جاوید کے متعلق بتایا کہ ہر پلاٹون کمانڈر چاہتا تھا کہ جاوید اس کی یونٹ میں جائے آخر اس کا ٹرم کمانڈر ہم سب پر بازی لے گیا اور جاوید کو اپنی یونٹ میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے پر جاوید کو توپخانے کی ایک ایسی یونٹ میں کمیشن ملا جسے 1965ء اور 1971ء کے علاوہ سیاچن کے محاذ پر اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل چکا تھا۔ توپخانے کی اس یونٹ نے بے شمار جنگی اعزازات حاصل کئے جس کی بنا پر اُسے ہیون آف دی ہیونز کا خطاب ملا۔ اس یونٹ نے پاکستان آرمی کے کئی جانے مانے نام پیدا کئے جو ترقی کی اعلیٰ ترین منازل پر پہنچے۔

جاوید نے اپنی یونٹ ہیون آف دی ہیونز میں اپنی عسکری زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت یہ یونٹ لاہور میں تھی۔ جاوید کے لئے یونٹ کا لاہور میں ہونا اس کے لئے انتہائی خوشی کا باعث تھا چونکہ اس وقت جاوید کے بہنوئی اوکاڑہ میں تعینات تھے اور اس کے لئے اپنی (آپا) بہن سے ملنا آسان تھا۔ بعد میں جاوید کے بہنوئی اوکاڑہ سے تبدیل ہوکر چونیاں آ گئے تو اس کے لئے بہن سے ملنا اور بھی سہل ہو گیا۔ یونٹ میں جاوید کا استقبال کرنے والوں میں کیپٹن دلاور، کیپٹن انعام اور کیپٹن شاہد اسے یونٹ کے امور اور فوجی زندگی کے اصول وضابطے سکھاتے جبکہ کرنل خالد (اب بریگیڈئیر) کی قیادت اور رہنمائی نے اس کے ارادوں کو مزید مضبوط کر دیا۔ وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر کی عادات، افسروں سے رابطے اور جوانوں کی دیکھ بھال کے طریقوں سے بے حد متاثر ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد جاوید اپنی یونٹ ہیون آف ہیونز کا نہ صرف حصہ بن گیا بلکہ وہ ہر میدان میں اپنی یونٹ کی کسی نہ کسی طرح ترجمانی بھی کرتا۔ اس کی قابلیت اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے کمانڈنگ آفیسر نے اسے یونٹ کا ایڈجوٹنٹ مقرر کیا تو وہ اپنا سارا وقت یونٹ ہی میں گزارنے لگا۔ صبح کی جسمانی تربیت کے بعد وہ دفتری کاموں میں مصروف رہتا اور پھر یونٹ کی فٹ بال ٹیم لے کر فٹ بال گراؤنڈ میں پہنچ جاتا۔ فٹ بال کے کھیل سے اسے سکون ملتا۔ جاوید کی کھیلوں سے دلچسپی نے اس کی یونٹ کے کھیلوں کے معیار کو اور بہتر بنایا اور جاوید یونٹ کے ہر فرد کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

یونٹ کی اچھی تربیت اور پیشہ ورانہ کارکردگی کی وجہ سے جاوید عسکری تربیت اور پیشہ ورانہ تعلیم کے ہر میدان میں اوّل رہا۔ اس نے عسکری تربیت کے جتنے بھی کورسز کئے ہمیشہ پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت کا آخری کورس آرمی سروسز کور سکول نوشہرہ میں کیا جس میں اوّل پوزیشن کا سرٹیفکیٹ اور انعام اس کی شہادت کے بعد اس کے بیٹے جنید جاوید نے وصول کیا۔

جاوید کا پاکستان آنے کا مقصد جہاد میں شمولیت اور بہن سے قربت تھا۔ جہاد میں شمولیت کا ذریعہ اس کا پاک فوج میں شمولیت کا باعث بنا جبکہ قدرت نے اسے کسی نہ کسی طرح اپنی بہن کے قریب ہی رکھا۔ لاہور میں اپنی معیاد پوری کرنے کے بعد جاوید کی یونٹ کوئٹہ چلی گئی اور چند ہی مہینوں بعد جاوید

کے بہنوئی کی تبدیلی بھی خضدار ہوگئی۔ دونوں یونٹیں یعنی جاوید اور اس کے بہنوئی کی یونٹ ایک ہی فارمیشن میں ہونے کی وجہ سے جاوید اکثر خضدار، گوادر اور قلات جاتا اور مہینے میں کئی کئی بار اپنی بہن سے ملتا۔اس کا بھانجا اور پیارا دوست شہریار جو کہ ایف.جی کالج کوئٹہ میں زیرِتعلیم تھا جاوید کے ساتھ ہی رہتا۔ جتنا عرصہ جاوید کوئٹہ میں رہا اس کی بہن بھی وہاں ہی رہی اور قدرت نے بہن بھائی کے پیار کو دوام بخشا اور انہیں دوری کا احساس نہ ہوا۔

شادی

الحاج راجہ بشیر احمد خان کا گھرانہ جب انگلینڈ منتقل ہو گیا تو سفید پوش ذیلدار راجہ سخی ولائت خان کی حویلی کی رونق بھی بتدریج کم ہوتی گئی۔ راجہ بشیر احمد خان جب انگلینڈ چلے گئے تو کچھ ہی عرصہ بعد راجہ سخی ولائت خان کے داماد مولوی محمد عزیز خان صاحب بس کے ایک حادثہ میں فوت ہو گئے۔ مولوی محمد عزیز خان صاحب انتہائی دیندار اور شریف النفس انسان تھے جو داماد ہونے کے علاوہ راجہ سخی ولائت صاحب کے چچازاد بھی تھے۔ مولوی محمد عزیز صاحب ابھی چند ماہ ہی کے تھے کہ ان کے والد راجہ وزیر خان وفات پا گئے۔ مولوی عزیز صاحب اپنے والدین کی واحد نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے ابتداً میں اپنے ماموں صوبیدار صلاح محمد خان آف ناڑا کوٹ کی پرورش میں رہے جو اس زمانہ میں میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھے۔ صوبیدار صلاح محمد خان نے اپنی عملی زندگی کا آغاز خاندانی روایات کے مطابق فوج ہی سے کیا اور راجپوتانہ رائفلز میں بھرتی ہوئے۔ آپ اپنے دور کے بہترین نیزہ باز، گھڑسوار اور کُشتی کے نامور پہلوان تھے۔ 1920ء میں جب انڈین پولیس میں کمی پوری کرنے کے لئے انگریز نے فوج سے بہترین ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے جوانوں کا چناؤ کیا تو صلاح محمد خان صاحب کو فوج سے پولیس فورس میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1921ء میں پرنس آف ویلز کی ہندآمد کے موقع پر پرنس کی حفاظت اور گارڈ آف آنر کے لئے جس دستے کا چناؤ ہوا اس میں بھی راجہ صلاح محمد خان کو شامل کیا گیا اور دورے کے اختتام پر آپ کو وائسرائے ہند کی جانب سے آپ کو صلاحیتوں کے اعتراف میں تعریفی سند دی گئی۔ راجہ صلاح محمد خان نے جنگ عظیم اوّل میں بھی حصہ لیا۔ پولیس فورس میں آپ کو سب انسپکٹر بھرتی کیا گیا جہاں تربیت کے اختتام پر آپ کو اعزازی شمشیر ملی۔ انڈین پولیس فورس میں آپ کا شمار بہترین پولیس آفیسروں میں ہوتا تھا۔ آپ عرصہ تک پولیس ٹریننگ سکول میں انسٹرکٹر بھی رہے اور تقسیم ہند سے قبل آپ ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ آپ کی ابتدائی فوجی زندگی کی وجہ سے لوگ آپ کو صوبیدار کہتے اور یہی لقب آپ کے نام کا حصہ بن گیا۔ میرٹھ میں تعیناتی کے دوران جب آپ کو اپنے بہنوئی کی وفات کی خبر ملی تو آپ گھر تشریف لائے اور اپنے بھانجے مولوی محمد عزیز صاحب کو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ آپ نے مولوی صاحب کا رجحان دیکھتے ہوئے بچپن ہی سے انہیں

دینی تعلیم دلوائی اور بعد میں انہیں بھی پولیس میں بھرتی کروادیا۔

ذیلدار سفید پوش راجہ سخی ولائت خان نے اپنے بیٹے کو انگلینڈ جانے کی اجازت تو دے دی مگر اندر ہی اندر وہ بیٹے کی جدائی میں پریشان رہنے لگے۔ اسی پریشانی کے دوران آپ کو داماد کی اچانک وفات کا صدمہ بھی ملا جس کی وجہ سے آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور آپ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ ذیلدار صاحب کی وفات اور الحاج راجہ بشیر احمد خان کی انگلینڈ منتقلی کے بعد ذیلدار صاحب کی حویلی کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ آپ کے گھر میں لگا رہنے والا میلہ آپ کے جنازے کے ساتھ ہی رخصت ہوا اور پھر وہ سماں کبھی بحال نہ ہوا۔ کیپٹن جاوید کی پاکستان آمد نے اس ویرانے کو ایک بار پھر بہار کا جھونکا دکھلایا جو بہت ہی مختصر رہا۔ تیس سال بعد 8 اگست 1999ء کی سہ پہر ایک اور جنازہ اس حویلی سے اٹھایا گیا۔ یہ جنازہ ایک ایسے مہمان کا تھا جو صرف دو گھنٹے کے لئے آیا اور پھر اپنے سفر آخرت کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ جنازہ سفید پوش ذیلدار راجہ سخی ولائت خان کے پوتے کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید تمغہ بسالت کا تھا۔ جو صرف ایک ماہ پہلے یعنی پانچ جولائی 1999ء کو اسی حویلی سے اپنے دو بچوں، بیوی، اپنی پیاری بہن اور بھانجوں سے رخصت ہوا تھا۔

جاوید کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنی بہن کے ہمراہ گاؤں آتا اور اپنے دادا کے اس مکان کی دیکھ بھال پر توجہ دیتا۔ اس نے الماریوں اور صندوقوں میں بند دادا اور پڑدادا کی کتابیں نکالیں انہیں پھر سے جلد کروایا اور گھر میں ایک لائبریری قائم کی۔ جاوید گھر آتا تو گاؤں کے سارے بچے اور نوجوان اس کے قریب رہتے۔ وہ سب کے ساتھ ملتا اور ان کے کام کاج میں بھی حصہ لیتا۔ وہ بچوں کی فرمائش پر انہیں کرکٹ کا سامان خرید کر دیتا اور پھر ان کے لئے ٹورنامنٹ کا بندوبست بھی کرتا۔ بچوں سے جاوید کی دوستی اور پیار کا ثبوت ان نوعمروں کی جانب سے ہر سال گاؤں میں جاوید شہید میموریل کرکٹ ٹورنامنٹ کا انعقاد ہے جس کا انتظام اب یہ نوعمر خود اس کی برسی کے موقع پر کرتے ہیں۔

جاوید کی دلچسپی اور گاؤں سے پیار دیکھتے ہوئے جاوید کی بہن نے والدین سے مشورہ کیا کہ جاوید کی پاکستان میں شادی کروادی جائے تا کہ اس کی دلچسپی اور لگن کا مرکز یہی رہے۔ اس سلسلہ میں جاوید کی رائے پوچھی گئی تو اس نے اپنی بہن کی پسند کو ہی ترجیح دی اور کہا کہ جہاں میری آپا (بہن) کہے گی وہی شادی کروں گا۔ جاوید کے ایک ماموں راجہ مہربان خان جو جاوید کے والدین کی غیر موجودگی

میں ان کے گھر اور جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے کی مرحومہ بیوی کی بیٹی محترمہ حمیدہ بیگم کے متعلق جب بہن نے رائے دی تو جاوید نے فوراً ہاں کر دی۔ جاوید کی بہن کا خیال تھا کہ محترمہ حمیدہ بیگم چونکہ اسی گھر میں پیدا ہوئی ہیں اور ان سے بہتر اس گھر کی دیکھ بھال کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اس کے علاوہ وہ تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ جاوید کی رائے معلوم کرنے کے بعد جاوید کی بہن نے انگلینڈ میں والدین اور بہن بھائیوں سے رابطہ کیا اور سب کی مشترکہ رائے سے فیصلہ ہوا کہ رسم نکاح گاؤں میں ادا کی جائے اور اس موقع پر اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو دعوت دی جائے چونکہ کئی سالوں بعد اس گھر میں خوشی کا موقع آیا تھا۔ اس کے بعد دولہا اور دلہن انگلینڈ چلے جائیں اور رخصتی وہاں پر ہو۔ تاکہ انگلینڈ میں مقیم عزیز رشتہ دار اور جاوید کے دوست بھی اس خوشی میں شریک ہو سکیں۔ جاوید ہر بات میں نیکی اور اچھائی کا پہلو دیکھتا۔ جب اس کی بہن نے شادی کے پروگرام کے متعلق جاوید سے پوچھا تو کہنے لگا۔ آپا جی یہ تو اچھا پروگرام ہے حمیدہ بیگم کی والدہ نہیں ہیں انہوں نے مشکل وقت دیکھا ہے اگر ہم انہیں خوشیاں دے سکتے ہیں تو کیوں اس میں کنجوسی کریں۔ مگر اسے کیا پتہ تھا کہ حمیدہ کی یہ خوشیاں بھی عارضی ہیں اس کی تقدیر میں غم ہی غم لکھے ہیں بچپن میں ماں اور جوانی میں شوہر کی جدائی کا غم اور پھر اس غم کو ساری زندگی تازہ رکھنے والے معصوم بچے جو دن رات اپنے باپ کو یاد کرتے اور اس کی واپسی کی راہیں دیکھتے ہیں۔ میری یہ تحریر مکمل ہونے تک جاوید کو ہم سب سے بچھڑے دو سال ہو جائیں گے۔ ان دو سالوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب جنید جاوید نے اپنے باپ کے متعلق نہ پوچھا ہوا۔ وہ جاتے وقت جنید سے کئی وعدے کر کے گیا تھا جنید ان وعدوں کو نہیں بھولا اور اسے اپنے ڈیڈی کا انتظار ہے۔ جنید جاوید نے قبرستان میں ایک نیا گھر بنتے دیکھا تو ماں سے پوچھا امی یہ کس کا گھر ہے۔ ماں کیا بتاتی کہ یہ اس شخص کا مزار ہے جو تم سے جلد لوٹنے اور واپسی پر تمہارے لئے نئی کار خریدنے اور تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کر کے گیا تھا مگر اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ یہ گھر نہیں شہید کا مزار ہے جسے اپنے مقصد کی منزل مل گئی۔ جو اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ میرے غم بانٹنے آیا تھا مگر اپنا عہد نہ نبھا سکا۔ وہ جاتے وقت مجھ سے عہد لے کر چلا تھا اور اب میں نے یہ عہد نبھانا ہے۔ جب جنید کی ماں اسے تسلی بخش جواب نہ دے سکی تو کسی بچے نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر ہے۔ جنید جاوید کو یہ گھر اچھا لگتا ہے۔ صاف شفاف مگر چھوٹا سا گھر جس کے عین مرکز میں سنگ مرمر سے بنی قبر ہے۔ اب جنید پانچ سال کا اور اس کا چھوٹا بھائی حمزہ جاوید تین سال کا

ہوگیا ہے۔ دونوں کے لئے جائے سکون اللہ کا یہ گھر ہے جہاں صبح وشام دونوں بھائی تیار ہوکر جاتے ہیں اور اپنے ڈیڈی کی واپسی کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ ان کے ڈیڈی اسی گھر میں مقیم ہیں۔ بچوں کی ذہنی کیفیت دیکھتے ہوئے ماں انہیں دادا، دادی اور چچاؤں کے پاس انگلینڈ لے گئی کہ شاید وہ باپ کو بھول جائیں اور نیا ماحول انہیں اپنی جانب متوجہ کر لے مگر یہ کیسے ہوسکتا۔ یہ اس جاوید کے بچے ہیں جس نے بارہ سال پہلے اس ماحول کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ حمزہ اور جنید نے انگلینڈ پہنچتے ہی واپسی کا مطالبہ کر دیا اور دادا، دادی سے التجا کی کہ ہمیں واپس بھیج دیا جائے۔ ہم تو اپنے ڈیڈی کی تلاش میں آئے تھے مگر وہ یہاں نہیں۔ جنید ڈیڑھ سال پہلے اسی گھر میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ آیا تھا۔ وہ اپنے چچا کو لے کر باپ کے کمرے میں گیا اس کی تصویر کو چوما اور پھر ہر اس جگہ پہنچا جہاں جہاں اس کے ڈیڈی اسے لے کر گے تھے۔ جب کہیں بھی اسے اپنے ڈیڈی نہ ملے تو اس نے ماں سے کہا کہ ہمیں واپس لے چلو۔ ہم گاؤں میں اللہ کے گھر جا کر اپنے ڈیڈی کی کارگل سے واپسی کی دعا مانگیں گے۔ بچوں کی بے چینی دیکھتے ہوئے ماں انہیں چند ماہ بعد واپس گاؤں لے آئی جہاں صبح وشام جنید جاوید اور حمزہ جاوید اللہ کے اس گھر میں اپنے ڈیڈی کیلئے دعا کرتے ہیں اور اپنی ماں کے دل کا زخم تازہ کرتے رہتے ہیں۔

23 جولائی 1994ء کی صبح جاوید کے بھائی، بہن، والدین اور کچھ رشتہ دار انگلینڈ سے اس کے گاؤں دبلہاہ راجگان پہنچے۔ ذیلدار سفید پوش راجہ سخی ولائت خان مرحوم کی حویلی کو جھنڈیوں اور قمقموں سے سجایا گیا۔ دور ونزدیک سے رشتہ دار مدعو ہوئے، بہنوں نے خوشی کے گیت گائے۔ جاوید کی آپا نے دولہا کے سر پر سہرا اپنے گھر میں باندھا اور گاؤں کی روایات کے مطابق بارات چلی۔ ڈھول باجوں کا اہتمام ہوا بارات پہلے گاؤں کا چکر لگا کر ذیلدار راجہ سخی ولائت صاحب کے دوسرے گھر میں گئی جہاں جاوید کی دوسری دادی رہتی تھیں۔ اس حویلی میں بارات کی تواضع کی گئی اور پھر حسب روایت حضرت مائی نوشہؒ کے مزار پر حاضری دی گئی۔ حضرت مائی نوشہؒ کے مزار سے متصل قبرستان میں فاتحہ خوانی ہوئی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آج یہ شہید ابدی نیند سو رہا ہے۔ بارات واپس گھر پہنچی تو رسم نکاح کے بعد شاندار دعوت کا اہتمام ہوا جو دو روز تک جاری رہا۔ اس دعوت پر اتنے لوگ مدعو تھے کہ جو پہلے روز نہ پہنچ سکے وہ دو روز بعد تک بھی آتے رہے اور دعوت جاری رہی۔ رسم نکاح کے کچھ عرصہ بعد پہلے دولہا اور دلہن انگلینڈ گئے تا کہ رخصتی کی رسم وہاں ہو۔ پروگرام کے مطابق جاوید کی بڑی بہن نے بھی ان کے ساتھ جانا تھا مگر

جاوید نے کہا کہ آپا ہمارے بعد آئیں تا کہ ہم سب اس موقع پر آپ کا استقبال کریں۔ وہ ہر جگہ بہن کا وقار بڑھانے اور ان سے اظہار عقیدت اور محبت جگانے کی جستجو میں رہتا۔ جاوید نے انگلینڈ پہنچ کر بہن کو وہاں پہنچنے کا وقت دیا اور پھر سارے دوستوں اور اہل خانہ کو لے کر ہیتھرو ائیر پورٹ پر پہنچا۔ اپنی آپا کا شاندار استقبال کیا اور کاروں کے جلوس میں بہن کو لے کر گھر پہنچا۔

انگلینڈ میں جاوید کی شادی بڑی ہی دھوم دھام سے ہوئی۔ بہن بھائیوں نے اس کی شادی کا خاص اہتمام کیا دولہا دلہن کو پہلے رولز رائیس میں بٹھا کر لوٹن اسلامک سنٹر لے گئے جہاں بارات نے اس جوڑے کی دائمی خوشیوں کی دعا مانگی۔ وہاں سے دولہا دلہن اپنی بہن کے ہمراہ بگھی پر بیٹھے اور یہ بگھی خراماں خراماں چلتی کمیونٹی سنٹر پہنچی جہاں دعوت ولیمہ تھی۔ یوں آزاد کشمیر کے گاؤں دبلہاہ راجگان سے شروع ہونے والی یہ تقریب اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ 36 میڈن ہال روڈ پر ختم ہوئی۔ اللہ نے اس جوڑے کو مزید خوشیاں دیں اور ان کے ہاں دو بیٹے جنید جاوید اور حمزہ جاوید پیدا ہوئے۔ جاوید کی شہادت کے وقت جنید کی عمر اڑھائی سال اور حمزہ صرف آٹھ ماہ کا تھا۔ جنید کی عمر کم تھی مگر وہ باپ کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ اپنے دل اور دماغ پر نقش کئے ہوئے ہے۔ دو سال گزرنے کے باوجود وہ اپنے باپ کا منتظر ہے اور ہر کسی سے پوچھتا ہے کہ کارگل کیسے جاتے ہیں۔ وہاں جانے والوں کو چھٹی کیوں نہیں ملتی اس معصوم کو کیا پتہ کہ کارگل جانے والے اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ جو واپس نہیں آئے اب قیامت کے روز ہی ملیں گے اور ان کا ڈیڈی بھی اسی قافلے میں شامل ہے جو کبھی واپس نہ آنے کے لئے گیا تھا۔

ہمیشہ خوش وخرم رہنے والا جاوید اچانک بدل گیا۔ وہ کسی آنے والے حادثے کا منتظر دکھائی دیتا اور ہر بات کو انتہائی سنجیدگی سے سنتا اور سوچ سمجھ کر جواب دیتا۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ جلدی جلدی گھر آتا اور چھٹی کا ہر ہر لمحہ اپنے بیٹے جنید کے ساتھ گزارتا۔ ان ہی دنوں جاوید نے اپنی بہن سے اجازت لیکر دو ماہ کی چھٹی لی اور اپنی بیگم اور بیٹے کو ساتھ لیکر انگلینڈ چلا گیا جہاں نومبر 1998ء میں اس کا دوسرا بیٹا حمزہ جاوید پیدا ہوا۔ حمزہ کی پیدائش کے بعد جاوید نے اپنے دونوں بیٹوں کے لئے برٹش نیشنلٹی اور پاسپورٹ کی درخواست دی تو سب لوگ حیران ہو گئے کہ جس شخص کو خود یورپ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اپنے معصوم بچوں کے مستقبل کے لئے اتنا پریشان کیوں ہے۔ اس کی دوڑ دھوپ اور پھر چند ہی دنوں میں بچوں کے پاسپورٹ حاصل کرنے کی جستجو دیکھ کر جاوید کی بہن نے اس سے پوچھا کہ بھائی تم اس بار اتنے سنجیدہ کیوں ہو۔ تمہیں بچوں کی کیا فکر ہے اس پر جاوید نے کہا کہ مجھے لگتا ہے میں ان سے جدا ہونے والا ہوں میں نہیں چاہتا کہ ان پر کوئی مصیبت آئے تو ان کا ٹھکانہ بھی نہ ہو۔ گو کہ میں نے یہ ملک چھوڑ دیا ہے مگر یہاں کے کچھ اچھے اصول بھی ہیں اور بچوں کی تعلیم کے لئے اچھا ماحول ہے۔ آخر میں نے بھی ان ہی درسگاہوں میں پڑھا ہے۔ اگر انسان کی فطرت اچھی ہو تو ماحول کا اس پر کم اثر ہوتا ہے۔ ویسے بھی تو لوگ لاکھوں روپے خرچ کر کے بچوں کو یہاں پڑھنے بھیجتے ہیں اگر کسی نے بگڑنا ہو تو اس کے لئے یورپ اور پاکستان سب برابر ہیں۔ اولاد ماں باپ سے تاثر لیتی ہے اور ان ہی کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ مجھے بھی اپنے جنید اور حمزہ سے یہی امید ہے۔ جاوید کی یہ باتیں سن کر اس کی بہن پر سکتہ طاری ہو گیا اور اس نے اٹھ کر جاوید کے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس بار سبھی کو جاوید کچھ بدلا بدلا لگا۔ وہ اپنے دوست عباس کے ساتھ گھومنے پھرنے بھی کم ہی نکلتا زیادہ وقت اپنے والدین اور بچوں کے ساتھ گزارتا۔ وہ صبح وشام جنید کو پارک میں لے جاتا اور اس سے باتیں کرتا۔ وہ اسے جی بھر کر کھلونے لیکر دیتا اور پھر اسے اپنا سکول اور فٹ بال گراؤنڈ دکھاتا اور جنید کے ساتھ کھیلتا۔ جاوید کی ان حرکتوں نے سب کو اداس کر دیا تو وہ کہنے لگا میں ویسے ہی بہن سے یہ سب کچھ کہہ گیا مجھے خود بھی پتہ نہیں میں نے ایسے کیوں کیا۔ یوں اس کے دو ماہ ختم ہوئے تو حسب معمول سارا خاندان اسے الوداع کہنے ایئر پورٹ پر آیا۔ اس بار وہ اپنے

دو بیٹوں اور بیگم کے ہمراہ تھا جو کہ اس کے لئے ظاہری خوشی کا باعث تھا مگر اندر سے وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ انگلینڈ کے اس سفر میں وہ سب رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں سے ملا اور اپنے ہم عمروں کو نصیحتیں کرتا رہا۔ جاوید کی سنجیدگی اور خاموشی نے سب کو پریشان کر دیا۔ اس کے دوست عباس نے اس سنجیدگی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا عباس لگتا ہے میں آپ سب کو چھوڑنے والا ہوں۔ تمہیں پاکستان کے حالات کا پتہ ہے یہ ہمارا ملک ہے ہم اس کی مٹی سے بنے ہیں ویسے تو ہر شخص کا رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اچھی یا بری تقدیر کا مالک ہے مگر ہمارے ہاں انصاف نہیں، علم کی کمی ہے اور لوگ ایک دوسرے کا حق چھیننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں نے سات آٹھ سالوں میں جو کچھ دیکھا ہے وہ قابل تعریف نہیں۔ اس پر عباس نے کہا کہ پھر تم واپس کیوں نہیں آ جاتے۔ جاوید نے جواب دیا یہ مردانگی نہیں۔ میں واپس جانے کے لئے نہیں گیا تھا یہ مایوسی ہے جبکہ میں مایوس نہیں اگر سب لوگ حالات سے مایوس ہوکر ملک چھوڑ دیں۔ اس کی مٹی کی حفاظت نہ کریں اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز نہ اٹھائیں تو کیا خیال ہے سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا بلکہ حالات بد سے بد تر ہو نگے۔ ہماری آزادی چھن جائے گی ہمارا قومی تشخص مٹ جائے گا۔ ہم سب اس دیوار کا حصہ ہیں جس نے اندرونی اور بیرونی دشمنوں اور حملہ آوروں کا سامنا کرنا ہے تاکہ قوم اور ملک محفوظ رہے۔ دیکھو عباس ایک مضبوط دیوار بنانے کے لئے بہت سا میٹیریل درکار ہوتا ہے۔ اس کے لئے فولاد، سیمنٹ، ریت، بجری، پتھر، پانی اور پھر مزدور اور اچھا معمار بھی ضروری ہے۔ ان سب اجزائمیں سے کسی ایک کی بھی اہمیت کم نہیں اور نہ ہی کسی ایک جز کے نکالنے اور منہا کرنے سے کام چلتا ہے۔ زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ہی زنجیر کی قوت ہوتی ہے۔ ہم سب اس زنجیر کی کڑیاں اور دیوار کا مٹیرل ہیں۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو ان کی حفاظت بھی میرا فرض ہے اگر کل میں نہ ہوا تو پاکستان میں ان کا کون ہے ان کے سارے عزیز رشتہ دار یہاں ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد ان کا یہاں آنا آسان ہو۔ یہ اچھی تعلیم حاصل کریں اور جہاں میں رُکوں یہ وہاں سے شروع کریں۔ جاوید کی یہ باتیں سن کر عباس کی آنکھوں سے آنسوں بہہ نکلے۔ وہ اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموشی سے آنسو بہاتا رہا شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا اس کی شہادت کے بعد اس کے خاندان نے جن حالات کا سامنا کیا اس کے لئے ضروری تھا کہ ان بچوں کا کہیں محفوظ ٹھکانہ ہوتا کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ علم حاصل کریں اور اپنے خاندان اور باپ کے روحانی

اثاثے کے وارث بن سکیں۔

جاوید کی شہادت کے بعد حکومت آزاد کشمیر کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے شہید کے مزار سے ملحقہ جنازہ گاہ پر آزاد کشمیر انتظامیہ اور اعلیٰ ترین سیاسی اور انتظامی قیادت کی مدد سے قبضہ کرنے کی کوشش کی جسے آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک فوجی جرنیل کی بھرپور مدد حاصل تھی۔ آزاد کشمیر حکومت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائیز شخصیت نے ایک موقع پر شہید کا جسد خاکی اس قبرستان سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش بھی کی مگر قدرت نے تاحال شہید کے جسد خاکی کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید نے شہادت سے پہلے جن خدشات کا ذکر کیا تھا وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شہید کے بچوں کو آزاد کشمیر کی انتظامیہ سے بچنے کی خاطر کئی ماہ تک علاقہ بدر ہونا پڑا۔

بچوں کو گاؤں چھوڑ کر جاوید اپنی یونٹ میں پہنچا تو دوستوں نے دوسرے بیٹے کی آمد پرخوشی کا اظہار کیا اور جاوید سے اصرار کیا کہ اب اپنی بیگم اور بچوں کو کوئٹہ لاؤ تا کہ ہم تمہارے گھر دعوت کھا سکیں۔ یونٹ کے افسروں اوران کی بیگمات کے کہنے پر جاوید نے کوئٹہ سے اپنے گھر کے لئے خریداری کی جس میں گھر کی ضرورت کی ہر چیز شامل تھی۔ جاوید کے اردلی سپاہی نصیراحمد کے مطابق جب ہم ایئر کنڈیشنڈ خریدنے گئے تو جاوید صاحب نے کہا نصیر چھوڑ واس کی ضرورت نہیں پڑے گی ابھی تو مجھے کورس کے لئے نوشہرہ جانا ہے واپسی پر دیکھیں گے۔ میں نے دوبارہ سیاہ چن کے لئے بھی والنٹیئر کیا ہے شاید نام آجائے کیوں نہ کورس اور سیاہ چن کے بعد فیملی لائی جائی پھر ہوسکتا ہے واپسی پر کوئٹہ سے کہیں اور ہی بدلی ہو جائے تو یہ سامان کون اٹھاتا پھرے گا۔ پھر ویسے بھی اب کوئٹہ میں رہنے کا مزہ نہیں رہا۔ آپا (بڑی بہن) بھی یہاں سے چلی گئی ہیں ان کی بدلی آزادکشمیر ہوگئی ہے ہوسکتا ہے میری بھی اس طرف پوسٹنگ ہوجائے یہ کہہ کراس نے مزید سامان خریدنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سپاہی نصیراحمد نے بتایا کہ جب ہم بازار سے واپس میس میں آئے تو یونٹ سے پیغام آیا کہ جاوید صاحب کی پوسٹنگ آ گئی ہے اورانہیں کارگل جانا ہے یہ سن کرصاحب کے چہرے پر رونق آ گئی اور کہنے لگے کہ نصیر وہ وقت آ گیا ہے کہ جس کا مجھے انتظار تھا۔ پوسٹنگ کی خبر سنتے ہی وہ مجھے لیکر یونٹ گئے اور خریدا ہوا سارا سامان دوبارہ پیک کیا اوراس پر چٹ لگادی کہ اگر میں واپس نہ آؤں تو یہ سامان میرے گاؤں میری بیگم کوبھجوا دیا جائے۔ نصیراحمد کہتا ہے کہ سامان پیک کرنے کے بعد ہم واپس آفیسر میس آئے تو جاوید صاحب نے مجھے روک لیا اور کہا کہ نصیر میرے پاس بیٹھوں تم نمازی ہواور دین سے لگاؤ رکھتے ہو ہم سب سپاہی ہیں اور سپاہی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد شہادت کا حصول ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے سب نے مرجانا ہے یہاں کوئی نہیں رہے گا۔ میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت نصیب کرے اورتم میرے لئے دعا کروکہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ رتبہ عنائت کرے۔ اب میں محاذ جنگ پر جارہا ہوں تم مجھے اپنی دعاؤں میں یادرکھنا مجھے لگتا ہے کہ میں واپس نہیں آؤں گا تم نے سات سال میری خدمت کی ہے میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا دیکھو اگر میں شہید ہو جاؤں تو تم میرے گاؤں کی مسجد میں اذان پڑھنا میں سنوں گا۔ نصیر تمہیں پتہ ہے

کے میں اپنے دوستوں کی مدد کرتا تھا میرے کچھ دوستوں نے مجھ سے قرض لے رکھا ہے میں تمہارے سامنے ان سب کو معاف کرتا ہوں اگر کسی کو ہمت ہو اور وہ خود تمہیں واپس کر دے تو میرے گھر بھجوا دینا مگر کسی سے مانگنا نہیں۔ یہ راز تمہارے اور میرے درمیان ہے تم نے کسی کا نام بھی ظاہر نہیں کرنا۔ پیسہ بے اہمیت چیز ہے اس کی وجہ سے دوستی پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ نصیر کہتا ہے کہ کیپٹن صاحب کی باتیں سن کر میری آنکھیں نم ہو گئیں میں دل میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی کیپٹن صاحب ہم سے دور جا رہے ہیں ان کی باتیں سن کر میں پریشان تھا مگر ان کے جوش اور جذبے میں کوئی فرق نہیں تھا وہ ہر وقت اپنی تیاری میں مصروف تھے۔ اور دوڑ دوڑ کر اپنے دوستوں اور یونٹ کے افسروں سے مل رہے تھے کبھی کیپٹن دلاور کو فون کرتے کبھی میجر شاہد اور کیپٹن انعام کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہتے وہ اکثر میجر شاہد کو کہتے کہ سر آپ سیاہ چن گے اور وہاں بیٹھ کر واپس آ گئے میں کچھ کر کے ہی آؤں گا۔

سپاہی نصیر کہتا ہے کہ ایک شام جاوید صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ نصیر تمہیں یاد ہے میرے ایک دوست آفیسر نے میرے بوٹ اٹھا لیے تھے جو میں انگلینڈ سے لایا تھا وہ بوٹ اسے پسند تھے ہم اس کے کمرے سے بدلے میں ہیٹر اٹھا لائے تھے آؤ ہیٹر واپس کریں اور اسے بتائیں کہ بوٹ ہماری طرف سے تحفہ ہیں۔ چلو جب تک بوٹ پہنے گا مجھے یاد رکھے گا۔ یہ کہہ کر مجھ سے ہیٹر اٹھوایا اور جا کر خود واپس کر دیا۔ کیپٹن صاحب جب کارگل کی تیاریوں میں مصروف تھے تو ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے کسی بڑے افسر نے انہیں بلایا۔ واپسی پر پتہ چلا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے کسی اعلیٰ افسر نے کہا ہے کہ اگر آپ کارگل نہ جانا چاہیں تو ہم آپ کی یہ پوسٹنگ کینسل کروا دیتے ہیں چونکہ اس وقت کیپٹن صاحب کی جس بیٹری میں پوسٹنگ تھی اس میں دوسرا کوالیفائیڈ افسر موجود نہیں تھا۔ چند روز بعد انہیں ہیون آف دی ہیونز کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل یعقوب خان نے بھی بلایا اور کہا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کا نام کارگل جانے والوں کی لسٹ سے خارج کیا جا سکتا ہے چونکہ یہاں بھی آپ کی ضرورت ہے مگر کیپٹن صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جب جانے کا وقت آ ہی گیا ہے تو چلے جانا چاہیے۔ کیا پتہ زندگی میں یہ چانس ملے یا نہ ملے۔

نصیر کہتا ہے پھر کیپٹن صاحب صبح و شام اپنے دوستوں اور یونٹ افسروں کے ساتھ دعوتوں پر مدعو رہے جو کہ حیران کن بات تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ یہاں کسی کے مہمان بن کر آئے تھے اور ہر کوئی انہیں

دعوت پر بلا کر الودعٰی کہہ رہا ہے۔ یونٹ کے سارے آفیسر اور ان کی بیگمات جاوید صاحب کو اپنے بھائیوں کی طرح چاہتے تھے۔اس مختصر وقت میں ہر گھر میں دعوت ہوئی اور ہر کسی نے انہیں الودعٰی کہا۔ آخر میں ڈویژن کمانڈر اور کمانڈر آرٹلری سے انٹرویو ہوا۔ واپسی پر کیپٹن صاحب نے بتایا کہ نصیر کمانڈر آرٹلری نے مجھ سے تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات کی ہے اور اس سارے وقت میں انہوں نے فلسفہ شہادت اور شہید کی زندگی پر باتیں کی ہیں۔ پھر مسکرا کر کہا اب مجھے یقین ہے کہ شہادت ضرور نصیب ہوگی پھر ہنس کر مجھے گلے لگالیا اور کہا کہ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔

اگلے روز جاوید صاحب یونٹ میں گئے سب لوگوں سے فرداً فرداً ملاقات کی اور پھر یونٹ کے گیٹ پر کھڑے ہو کر کہا کہ گڈ بائی ہیون آف دی ہیونز۔ یونٹ کے کچھ کھلاڑی انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے گئے جہاں ہماری زندگی کی سات سالہ رفاقت اختتام پذیر ہوئی۔

آخری چھٹی

جاوید جب بھی چھٹی آتا خاموشی سے گھر پر رہتا یا پھر گاؤں کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ بچے اکثر اسے دور دور تک لے جاتے اور اس سے بے حد پیار کرتے۔ اس بار وہ بچوں کے ساتھ صرف ایک ہی بار گھر سے نکلا۔ کھیل ختم ہوا تو وہ اپنے پیارے دوست اور بھانجے شہریار کے ساتھ سڑک کے کنارے پرانے قبرستان میں رُک گیا۔ قبروں سے ذرا ہٹ کر میدان میں بیٹھا اور شہریار سے کہنے لگا دیکھو شیر یہ جگہ کتنی سحر انگیز ہے۔ اس مٹی سے خوشبو آتی ہے۔ شہریار نے کہا ماموں جی شاید بارش کی وجہ سے ایسا ہے یا ہوسکتا ہے گھاس اور جڑی بوٹیوں کی خوشبو ہو۔ جاوید بولا نہیں شیر یہ خاص خوشبو ہے یہ بارش کی وجہ سے نہیں یہ اس مٹی کا حسن ہے۔ پھر دونوں ماموں بھانجا کچھ دیر وہاں رکے رہے اس مٹی میں واقعی خوشبو تھی چونکہ اس کا خمیر اسی مٹی سے بنا تھا اور چند ہفتوں بعد اس کا مستقل ٹھکانہ اس مٹی میں بننے والا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج اس شہید کی قبر اور مزار ہے۔ کسے پتہ تھا کہ وہ جانے سے پہلے اپنے سارے کام خود ہی سرانجام دے رہا ہے۔ کچھ دیر یہاں خاموش بیٹھنے کے بعد اس نے پھر شہریار سے پوچھا کے ساتھ والی زمین کس کی ہے۔ شہریار نے کہا ماموں جی آپ کو نہیں پتہ یہ زمین آپ کی ہے شہریار کی بات سن کر وہ بولا واقعی مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔ یہ بڑی ہی رونق والی جگہ ہے دیکھو یہاں سے سارا علاقہ نظر آتا ہے کتنا اچھا نظارہ ہے یہاں سکون ہے تنہائی ہے میں آج ماموں سے پوچھوں گا اگر واقعی یہ جگہ ہماری ہے تو پھر میں ابو سے کہوں گا کہ یہاں میرے لئے مکان بنوائیں۔

یہ چھٹیاں اس نے اپنے بچوں اور بہن کے ساتھ گزاریں جی بھر کر باتیں کیں اور پندرہ دن وہ ایک دوسرے کے قریب رہے۔ وہ ہر وقت حمزہ اور جنید سے کھیلتا ان سے باتیں کرتا۔ جنید کہتا ڈیڈی آپ سیاہ چن سے واپس آئیں تو میرے لئے کار خریدیں میں کار پر بیٹھ کر آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ اس مختصر وقت میں وہ اپنے سب رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی ملا جو کہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ ایک تو اسے اپنے عزیز رشتہ داروں سے واقفیت نہیں تھی دوسرا وہ صحیح طریقے سے پہاڑی زبان بھی نہیں بول سکتا تھا اس لئے اسے اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اسے اپنے خاندان کے بچوں کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ سب کو فرداً فرداً بھلا کر علم حاصل کرنے کی تلقین کرتا اور انہیں امتحان پاس کرنے کے

گر سکھا تا۔اس نے ہر بچے کے لئے اس کی ذہنی استعداد کے مطابق منصوبہ بندی کر رکھی تھی وہ رشتے کے دو چچاؤں گلفراز اور گلزرین جو کہ اس کے ہم عمر بھی تھے کی ذہانت سے بے حد متاثر تھا وہ اکثر کہتا کے انہیں تھوڑا سا گائیڈ کرنے کی ضرورت ہے۔ایک بار تعلیمی میدان میں چل نکلے تو کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔اس نے ہر بچے کا ذہن پڑھ رکھا تھا اور ان کیلئے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر قدرت نے اسے کومہلت نہ دی۔

وہ اپنی بہن سے کہتا آپا انوار کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ جانے دینا اور شہر یار کو فوج میں بھیجنا۔اپنے دونوں بیٹوں کے متعلق جاتے وقت اپنی بیگم کو وصیت کی کہ انہیں حافظ قرآن بنانا۔

روانگی سے چند لمحے قبل وہ اپنی بہن اور بھانجوں کو خدا حافظ کہنے کے بعد اپنی بیگم سے ملا اور واضح الفاظ میں کہا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے میں اس حالت میں واپس نہیں آؤنگا۔آپ سکول میں پڑھاتی رہنا نوکری نہ چھوڑنا اس طرح زندگی مصروف رہے گی۔میرے بچوں کی تعلیم پر توجہ دینا میں نے ان کے برٹش پاسپورٹ اس لئے بنوائے ہیں کہ اگر یہاں حالات خراب ہوں تو انہیں میرے ماں باپ کے پاس لے جانا۔یہ کہہ کر وہ گھر سے چلا اور پھر گاؤں سے باہر کھڑے ہو کر کچھ دیر تک اپنے بچوں اور بہن کو دیکھتا رہا اور پھر اپنے سفر آخرت پر چل دیا۔

پانچ جولائی کے روز تین بجے وہ گھر سے راولپنڈی کے لئے نکلا جہاں اس نے اپنے بہنوئی اور پھوپھی زاد بھائی لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب کو ملاقات کے لئے بلایا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل ایوب جن کی یونٹ آزاد کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر تعینات تھی اپنے بھائی سے ملنے راولپنڈی پہنچے تو وہ پہلے سے ہی وہاں منتظر تھا۔ وہ کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور بتایا کہ مجھے شہر یار نے کہا ہے کہ ماموں جی اپنے ساتھ ریڈیو لے جانا میں اسلام آباد ریڈیو کو خط لکھونگا اور آپ کو پیغام بھجواؤں گا اور ان سے فرمائش کروں گا کہ وہ میرے ماموں کی پسند کا قومی نغمہ (وطن کی مٹی گواہ رہنا) سنائیں۔ پھر اپنا آرگنائزر (کمپیوٹر ڈائری) نکال کر دکھائی اور کہا کے شیر کہتا تھا کے جو کچھ کارگل میں دیکھیں وہ اس پر لکھ لینا انوار آپ کے تاثرات اپنے رسالے (میری آواز) میں چھاپے گا۔ وہ دیر تک شہر یار کے متعلق باتیں کرتا رہا اور پھر کہا لالہ میں اپنی بیگم کو کچھ باتیں بتا آیا ہوں اسے کہنا ہو سکے تو ان پر عمل کرے۔ ہاں آپ جب بھی گھر جائیں جنید کے لئے چاکلیٹ ضرور لیجائیں اور اسے بتائیں تمہارے ڈیڈی نے بھجوائے ہیں۔

اس مختصر ملاقات کے بعد وہ کارگل جانے والے دیگر ساتھی افسروں کے ساتھ چکلالہ آفیسرز مس چلا گیا جہاں سے اگلی صبح ان نوجوان آفیسروں کو بذریعہ ہیلی کاپٹر اپنی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ سرانجام دینے محاذ جنگ پر پہنچنا تھا۔

۶ جولائی کے دن جاوید اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گلگت اور پھر چند روز بعد سکردو پہنچا جہاں سے انہیں ان یونٹوں میں بھیج دیا گیا جن کے ساتھ انہیں اپنی ڈیوٹی کے لئے تعینات کیا گیا تھا۔ جاوید جب اپنے دوساتھی کپتانوں کے ہمراہ اس نئی رجمنٹ میں پہنچا تو انہیں ڈیوٹی کے متعلق بتایا گیا۔ رجمنٹ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل ضیاً نے بتایا کہ جب یہ تین نوجوان کیپٹن میرے پاس آئے تو انہیں کچھ فارم دئے گئے جن پر انہیں اپنے آرمی کورسز، تعلیمی معیار اور دیگر معلومات لکھنی تھیں۔ کرنل ضیاً کے مطابق جب میں نے جاوید کا تعلیمی ریکارڈ دیکھا تو حیرانگی ہوئی اور اس کے والدین کو دل ہی دل میں داد دی جنہوں نے اتنا قابل اور ہونہار بیٹا پاکستان آرمی میں خدمات کے لئے تیار کیا۔ جب میں نے جاوید سے پوچھا کہ اتنے اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ اسے انگلینڈ میں اچھی نوکری مل سکتی تھی تو کہنے لگا سر مقصد نوکری نہیں تھا وہ تو اب بھی مل سکتی ہے مقصد کچھ اور تھا جس کے لئے اتنا انتظار کیا اور آج اس کی براری کا وقت آ پہنچا ہے۔ رجمنٹ ہیڈکوارٹر میں چند روز گزارنے کے بعد رجمنٹ کمانڈر نے تینوں نئے آنے والے افسروں کو بلایا اور کہا کہ ربانی پوسٹ پر تعینات کیپٹن خلیل شہید ہوگئے ہیں ان کی جگہ ایک کیپٹن نے جانا ہے آپ تینوں میں سے اگر کوئی جانا چاہے تو اپنا نام دے یا پھر میں خود کسی کو اس پوسٹ پر تعینات کرتا ہوں۔ کرنل ضیاً کہتے ہیں کہ ابھی میرے الفاظ مکمل ہوئے ہی تھے کہ جاوید اقبال کھڑے ہوگئے اور کہا کہ سر میں جانا چاہتا ہوں۔ اس پر میں نے کہا جاوید آپ بیٹھیں ابھی تو بات مکمل نہیں ہوئی ہوسکتا ہے آپ کے دوسرے دوساتھیوں میں سے کوئی جانا چاہتا ہو پھر مجھے بھی اپنا اختیار استعمال کرنے دو شاید میں آپ تینوں کے علاوہ کسی اور کو بھیج دوں۔ میرے الفاظ سن کر کیپٹن جاوید نے کہا سر آپ نے ہمیں بلایا ہے اور ہم کوئٹہ سے محض اسی کام کی تکمیل کے لئے آپ کے ساتھ آئے ہیں۔ میں ان دونوں سے سینئر ہوں پہلے پوسٹ پر ڈیوٹی دینا میرا فرض ہے۔ زندگی رہی تو سب باری باری اپنا کام کرتے رہیں گے۔

کرنل ضیاً نے بتایا کہ مجھ سے اجازت لے کر کیپٹن جاید یونٹ کینٹین پر چلے گئے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا۔ جاوید نے اپنا بٹوہ نکالا اور اس میں جو رقم تھی گن کر کینٹین پر دے دی اور کہا یہ پاس رکھ لو۔ فیلڈ ایریا میں کوئی بینک یا دوسرا انتظام تو ہوتا نہیں اس لئے سارا لین دین کینٹین ٹھیکیدار کے

ذریعے ہی ہوتا ہے۔ پھر جاوید نے سگریٹ کے چند پیکٹ اور کچھ ٹافیاں لیں اور واپس چل پڑا۔ واپسی پر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو سلام کرنے میرے قریب آیا ہم نے تھوڑی دیر تک باتیں کیں میں نے کرنل ایوب کے متعلق پوچھا چونکہ مجھے پتہ چلا تھا کہ جاوید کے بہنوئی کرنل ایوب میرے کورس میٹ ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ جاوید ابھی جانیکی کیا جلدی ہے کچھ روز یہاں رکو بعد میں چلے جانا مگر اس نے اصرار کیا اور ہم سب سے مل کر ربانی پوسٹ کی طرف چل دیا۔ رجمنٹ ہیڈ کوارٹر سے ربانی پوسٹ کی مسافت تین روز کی تھی کیپٹن اشفاق جو کہ وہاں گن پوزیشن آفیسر کی ڈیوٹی پر تعینات تھے کہتے ہیں کہ یہ فاصلہ کیپٹن جاوید نے ایک ہی روز میں طے کیا اور اسی روز شام کو ربانی پوسٹ پر پہنچ کر رجمنٹ ہیڈ کوارٹر میں اپنی آمد کی اطلاع دیدی۔

بلتستان کا یہ علاقہ جواب دنیا کے لئے ایک دشوار گزار اور سب سے بلند ترین محاذ جنگ بن کر سامنے آیا ہے۔ حقیقت میں کشمیر کی قدیم تاریخ کا ایک گم گشتہ باب اور تہذیب کشمیر کا چھپا خزانہ ہے۔ قدیم تاریخی کتب کے مطالعے اور شہیدوں کے خون کی مہک نے راقم کی بے چینی میں اضافہ کیا تو ایک صبح اپنا مختصر سفری سامان لے کر میں اس آباد علاقہ تک جا پہنچا جس سے آگے ربانی۔۲ نامی فوجی چوکی واقع ہے۔ یہ جگہ اب میرے ہی وجود کا حصہ ہے چونکہ اس مٹی میں پیدا ہونے والے پھول میرے جیک کی شہ رگ سے بہنے والے خون کی خوشبو اور رنگ لیکر کھلیں گے۔ اس مٹی میں کیپٹن خلیل کی معصومیت، شیر خان کی جرأت و بے باکی، میرے دوست فیصل گھمن کی مسکراہٹوں سمیت درجنوں نوجوان افسروں اور سینکڑوں مجاہدوں کی امیدوں کے خزانے کا راز دفن ہے جسے کھوجنا ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ جب جیک کی یادیں میرے سینے میں غبار پیدا کرنے لگیں تو میں اس مقدس زمین کی زیارت کرنے ربانی۔۲ کے قریب ترین بلتی گاؤں گنوک پہنچا۔ جہاں سے آگے وہ سنگلاخ چٹانیں اور گہری وادیاں ہیں جن کی اُوٹ سے جیک اور خلیل نے ہفتوں دشمن کی یلغار کو روکے رکھا اور مجاہدین کے فتح کئے ہوئے علاقہ پر دشمن کے ناپاک قدم نہ جمنے دیئے۔ ربانی۔۲ ایک جلدی میں بنائی ہوئی دیدبان چوکی ہے جس سے سارے علاقہ پر نظر رکھی جا سکتی ہے اور دشمن کی نقل و حرکت دیکھ کر اس پر موثر اور کارگر فائیر کر کے اسے واصل جہنم کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح یہ چوکی فوجی اہمیت کا اہم مقام ہے ویسے ہی یہ دشمن کی آنکھ میں کانٹا بھی تھا اور دور سے دشمن اپنی بوفر توپوں اور میزائلوں سے دن رات اس پر آگ برساتا رہتا تاکہ دیدبانی کے فرائض سرانجام دینے والوں کی کارکردگی کو متاثر کیا جائے۔ دشمن کی اسی شدید گولہ باری کے نتیجے میں پہلے کیپٹن خلیل اور بعد میں کیپٹن جاوید اقبال (جیک) نے جام شہادت نوش کیا۔

یہ چوکی اس علاقہ کی رکھوالی کرتی تھی جس پر دشمن اعلان واشنگٹن کے بعد ہر حال میں قبضہ کرنا چاہتا تھا چونکہ اس علاقہ کو دوبارہ اپنے قبضہ میں لئے بغیر اسے وہ نتائج حاصل نہیں ہو رہے تھے جس کے حصول کے لئے اس نے ہزاروں فوجی مروائے کروڑوں ڈالر کا اسلحہ وایمونیشن ضائع کیا اپنے جنگی ہیلی کاپٹر اور لڑاکا ہوائی جہاز تباہ کروائے اور پھر اس ندامت کو فتح میں بدلنے کے لئے مزید کروڑوں روپے

خرچ کر کے کئی ماہ تک میڈیا وار اپنے ہی عوام کے خلاف لڑی تا کہ بھارتی عوام کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ اس محدود جنگ کے مثبت نتائج حاصل کر لئے گئے ہیں۔ ربانی۔۲ سے مشرق اور جنوب مشرق کا علاقہ ایک ایسی سطح مرتفع ہے جو مغرب اور جنوب مغرب کی جانب ڈھلوانی زمین اور چھوٹی چھوٹی وادیوں پر مشتمل ہے۔ ربانی۔۲ کی چٹانی دیوار اور اونچائی کے بعد بلتستان کی جانب بتدریج ڈھلوان ہے جو کسی بھی حملہ آور کے لئے پیش قدمی میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ سے پہلے بلتستان بشمول کارگل شمالی علاقہ جات ہی میں شامل تھے۔ اس وقت اس علاقہ کی حفاظت کی طرف خاص توجہ نہیں دی گئی۔ علاقہ کی رکھوالی کے لئے ناردرن ایریا سکاؤٹس کی محدود نفری اس علاقہ میں تعینات تھی جن کی تربیت محض واجبی تھی اور انہیں جدید اسلحہ سے بھی کبھی لیس نہیں کیا گیا تھا۔ دشمن نے عرصہ سے ہماری اس کمزوری پر نظر رکھی ہوئی تھی جس کی تکمیل کا وقت ضائع کئے بغیر دشمن کی ماؤنٹین انفنٹری جسے توپخانے اور ہوائی فوج کی بھرپور مدد حاصل تھی علاقہ پر یلغار کر کے ناردرن ایریا سکاؤٹس کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوگئی۔ 1971ء کے بعد شمالی علاقہ جات کے بے شمار آباد علاقے دشمن کے قبضے میں چلے گئے۔ بھارتی افواج نے علاقہ پر گرفت مضبوط کرنے کے لئے سری نگر کارگل لیہ ہائی وے تعمیر کی اور کارگل، دراز، لداخ اور لیہ کو آپس میں ملا کر انتظامی یونٹ قائم کر دیے۔ سرینگر کارگل ہائی وے کی لمبائی 434 کلومیٹر ہے۔ جو سرینگر سے گاندربل ککن، سونامرگ، دراس، کھربو سے کارگل اور پھر لیہ تک جاتی ہے۔ اس سڑک پر درہ زوجیلا اور درہ فوچولا اہم مقامات ہیں جن پر کنٹرول حاصل کرنے سے اس علاقہ کی مکمل ناکہ بندی کی جا سکتی ہے۔ لیہ لداخ کا مرکزی شہر ہے جہاں سے یہ سڑک دم چوک سے ہوتی ہوئی تبت کو کشمیر سے ملاتی ہے۔

راقم کی معلومات کا ذریعے وہ معصوم بلتی ہیں جو کبھی ان راستوں سے ہوتے سرینگر اور لیہ تک جاتے اور محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ یہ بوڑھے جو موجودہ ملٹری اصلاحوں اور جنگی چالوں سے تو واقفیت نہیں رکھتے مگر زمین کے چپے چپے سے ضرور واقف ہیں۔ یہ لوگ زمینی معلومات کا خزانہ ہی نہیں بلکہ تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں جس کے بکھرے الفاظ کو اوراق میں پھر سے محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔

ربانی۔۲ پر کیپٹن خلیل کی شہادت کے بعد جب جاوید پہنچا تو اس جگہ پر دشمن دن رات آگ

برسارہا تھا۔دشمن اپنی پوری زمینی قوت لگا کراس علاقہ کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش میں تھا مگر پاکستانی توپخانے کی مسلسل اور کارگر گولہ باری اور زمینی دستوں کی جرأت و دلیری کے آگے دشمن کی تمام چالیں بے کار تھیں۔ جب بھی دشمن ذرا سر نکالتا۔ ربانی۔۲ پر بیٹھا توپخانے کا دیدبان فوراً حرکت میں آکر اپنی توپوں کو ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے کے لئے ہدف دیتا اور دشمن کا منصوبہ خاک میں ملا دیتا۔ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر دشمن کا ہر وار سہنا اور پھر موثر کاروائی سے دشمن کا سر کچلنا ایسے ہی سرفروشوں اور سر بکفوں کا کام ہے جن میں سے ایک کیپٹن جاوید اقبال شہید بھی تھا۔ گن پوزیشن آفیسر کیپٹن اشتیاق گورسی کے مطابق جب بھی دشمن کی گولہ باری میں وقفہ آتا کیپٹن جاوید مجھ سے بات کرتے اور کہتے اشتیاق وہ تو تھک گئے ہیں۔اب تمہاری باری ہے۔انہوں نے ہزاروں گولے فضا میں اڑا دیئے اور کچھ حاصل نہیں ہوا تمہارا نشانہ ٹھیک لگنا چاہیے۔اشتیاق کہتے ہیں کہ میں جواب دیتا سر نشانہ تو آپ نے بتانا ہے آپ حکم کریں نشانہ ٹھیک لگے گا پھر اسی ہنسی مذاق میں ہمیں ہدف ملتے جن کا نتیجہ ہمیشہ عمدہ رہتا۔کیپٹن اشتیاق احمد گورسی کے مطابق ہماری دوستی کا یہ سفر بارہ دنوں پر محیط ہے۔ان بارہ دنوں میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا تھا جب کیپٹن جاوید کی پوسٹ دشمن کی گولہ باری سے محفوظ رہی ہو ایسے لگتا تھا کہ دشمن ہر حال میں اس پوسٹ کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ایک طرف دشمن کی آگ برساتی توپیں تھیں اور دوسری جانب کیپٹن جاوید کا حوصلہ عزم اور حس مزاح۔کیپٹن جاوید نے کسی بھی لمحے گھبراہٹ، پریشانی یا پھر خوف کا تاثر نہ دیا اور کھلی فضا میں بیٹھے دشمن کی مسلسل گولہ باری کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

۵۔اگست 1999ء کی صبح کیپٹن جاوید اقبال نے ایک بار پھر کیپٹن اشتیاق سے رابطہ کیا اور دشمن کی نقل و حرکت کی خبر دے کر انہیں تیار رہنے کو کہا۔تھوڑی دیر بعد جب دشمن کی نقل و حرکت واضح ہوئی تو کیپٹن جاوید اقبال نے کیپٹن گورسی کو دشمن پر فائر کرنے کو کہا تو دوسری جانب سے دشمن نے توپخانے کا زور بڑھا دیا۔کیپٹن گورسی کہتے ہیں کہ جتنا فائر دشمن نے ۵۔اگست کی صبح سے دن چار بجے تک کیا اتنا فائر پچھلے کئی ماہ سے نہیں ہوا تھا۔اس مسلسل گولہ باری کے دوران ایک بار پھر کیپٹن جاوید سے رابطہ ہوا تو میں نے پوچھا سر حالات کیسے ہیں۔اس پر انہوں نے ہنس کر کہا کہ آج حالات بڑے گرما گرم ہیں۔میں نے کہا کہ اب آپ واپس بھی آنے والے ہیں آپ کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہے۔کیپٹن جاوید نے جواب دیا نہیں لگتا نہیں کہ واپس آؤں۔ان الفاظ کے ساتھ ہی ہمارا یہ رابطہ ختم ہو گیا میں سمجھا شاید فائر کی وجہ سے

لائن ٹوٹ گئی ہے اور جونہی فائر بند ہوگا لائن بحال ہو جائے گی مگر وہاں تو زندگی کی لائن کٹ گئی تھی۔ توپ کے گولے کا ایک ٹکڑا کیپٹن جاوید اقبال کی گردن پر لگا جس سے ان کی شہ رگ کٹ گئی۔ یوں انگلینڈ کے شہر لوٹن سے شروع ہونے والا شہادت کا یہ سفر لمحہ بہ لمحہ منزل بہ منزل ۵۔ اگست 1999ء کی سہ پہر 3 بجکر 15 منٹ پر کارگل کی ان سیاہ چٹانوں کے درمیان جسے ربانی۔۲ کہا جاتا ہے پر اختتام پذیر ہوا۔

منزل پر پہنچ کر جاوید نے دو بار ٹیلی فون پر گھر رابطہ کیا اور اپنی خیریت کی اطلاع دی اور دو خط بھی لکھے۔ ایک اپنے پھوپھی زاد بھائی راجہ ذوالقرنین اور دوسرا اپنے ماموں راجہ مہربان خان کے نام لکھا۔ دونوں خطوط میں بار بار لکھا کہ میں ٹھیک ہوں میری فکر نہ کریں۔ وہ اردو نہ لکھ سکنے کی وجہ سے اپنی بات درست انداز میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کئی بار لکھا میں ٹھیک ہوں۔

وہ چلتے وقت بہت سے وعدے کر کے گیا تھا۔ واپسی پر اس نے اپنے بیٹے جنید کے لئے نئی کار خریدنی تھی اور اسے اپنے ساتھ کوئٹہ لے جانا تھا۔ شہریار کے لئے میدان جنگ میں بیٹھ کر ڈائری لکھنی تھی اور اپنی آپا کے ساتھ مل کر اپنے گھر کے لئے خریداری کرنی تھی۔ وہ انگلینڈ سے چلتے وقت عباس اور محمود سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اگلے سال گرمیوں کی چھٹیاں پھر اکٹھے گزاریں گے مگر وہ کوئی بھی وعدہ پورا نہ کر سکا اور پانچ اگست دن کے تین بج کر پندرہ منٹ پر کارگل کی ایک بلند چوٹی سے عدم کی بلندیوں کی طرف پرواز کر گیا۔

پتہ نہیں آج اس کے گھر پر بے چینی کیوں تھی۔ اس کی بہن نے اپنے بیٹے شہریار کو کہا کہ ہوسکتا ہے آج جاوید کا فون آئے اس لئے تم ٹیلی فون کے قریب ہی رہنا۔ جنید بار بار اپنی پھوپھی سے پوچھ رہا تھا کہ سیاہ چن کتنے دنوں میں پہنچا جاتا ہے۔ وہاں ٹیکسی جاتی ہے یا جہاز۔ وہاں سے واپس کیسے آتے ہیں۔ وہ نام لئے بغیر اپنے ڈیڈی کو بار بار یاد کر رہا تھا۔ اس کی بے چینی کی انتہاً بڑھ گئی تو ماں کو کہنے لگا مجھے ڈیڈی کی فلم لگا کر دو میں اسے دیکھ کر سونا چاہتا ہوں۔ انگلینڈ میں حاجی بشیر صاحب بھی اپنے بیٹے کی یاد میں پریشان تھے۔ کسی نے بتایا کہ لوٹن میں مقیم ملک شفیع صاحب کا بیٹا سکردو کے ملٹری ہسپتال میں ڈاکٹر ہے اور ملک شفیع صاحب کوٹلی آزاد کشمیر کے ہی رہنے والے ہیں۔ حاجی بشیر صاحب لوٹن میں مقیم ملک صاحب کے پاس گئے اور بتایا کہ میں نے اپنے بیٹے کو خواب میں دیکھا ہے کہ وہ زخمی ہے۔ اس کی گردن پر سفید پٹی بندھی ہوئی اور وہ سکردو کے ملٹری ہسپتال میں ہے۔ حاجی صاحب نے کہا کہ یہ محض خواب ہے اور ہوسکتا ہے میری بیٹے سے محبت کا تقاضا ہو۔ انہوں نے ملک صاحب سے درخواست کی کہ آپ اگر سکردو فون کر کے اپنے بیٹے سے پوچھ لیں کہ وہاں کوئی کیپٹن جاوید زخمی ہو کر تو نہیں آیا۔ حاجی

بشیر صاحب کو کیا پتہ تھا کہ ان کا خواب پدر یوسفؑ کی طرح سچ ہے۔ جاوید کی گردن پر واقعی سفید پٹی بندھ چکی تھی اور اس کا خاکی جسم سکردو کے ملٹری ہسپتال کے ایک کونے میں تابوت میں بند پاکستان کے سبز ہلالی پرچم میں لپٹا چکلالہ ایئر بیس پر روانگی کے لئے تیار تھا۔

فوج میں آنے سے پہلے جاوید اپنی بہن سے ملنے ایک بار پاکستان آیا تو ان دنوں اس کے بہنوئی سپیشل سروسز گروپ کی ایک یونٹ جو تربیلہ میں تھی میں تعینات تھے۔ جاوید تقریباً ایک ماہ بہن کے ساتھ تربیلہ رہا تھا اور وہاں پر یونٹ کے افسروں سے بھی ملا تھا۔ اس یونٹ کے ایک افسر لیفٹیننٹ کرنل راجہ ضیغم محمود عباسی جو کہ سکردو میں تعینات تھے نے جاوید کو پہچان کر اس کی شہادت کی خبر اس کے بہنوئی لیفٹیننٹ کرنل ایوب کو دی تا کہ وہ چکلالہ سے کفن گاؤں لے جائیں۔ لیفٹیننٹ کرنل ایوب جنہیں جاوید ایک ماہ پہلے خدا حافظ کہہ کر گیا تھا چکلالہ میں بیٹھے بھائی کی آمد کے منتظر تھے کہ گاؤں میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شہریار نے اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق کال سنی۔ دوسری جانب سکردو سے توپخانے کے ایک کیپٹن نے اطلاع دی کہ آپ کا ماموں کیپٹن جاوید اقبال شہید ہو گیا ہے۔ شہریار حوصلے اور ہمت سے اپنے پیارے ماموں کی شہادت کا پیغام سنتا رہا اور جواب میں کچھ نہ بولا۔ جب ماں نے پوچھا تو کہنے لگا امی جان ماموں جی شاید ایک دو روز میں واپس آ جائیں۔ سکردو سے ان کے کسی دوست نے بتایا ہے کہ ان کی واپسی کی اطلاع ان کے گھر دی جائے۔ ماں کو یہ پیغام دے کر شہریار گھر سے نکل گیا۔ اس معصوم بچے کے لئے مشکل تھا کہ وہ اتنا غبار اپنے سینے میں محفوظ رکھے۔ شام تک انتظار کرنے کے بعد اس نے سارا واقعہ اپنے تایا کو بتایا مگر کسی کو ہمت نہیں تھی کہ وہ جاوید کی بہن، بیوی اور بچوں سے بات کرے۔

آخر کب تک یہ راز پنہاں رہتا۔ ادھر سکردو سے ڈاکٹر صاحب نے انگلینڈ میں مقیم اپنے والد کے ذریعے حاجی بشیر صاحب کو اطلاع دی تو سارے خاندان پر رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہر دل زخموں سے چور اور آنکھ اشکبار ہو گئی۔ علاقہ بھر میں یہ دردناک خبر آن واحد میں پھیل گئی کہ ذیلدار راجہ سخی ولائت صاحب کا پوتا آج نئی سج دھج سے میدان کارزار سے واپس آ رہا ہے۔ ہزاروں لوگ اس کے گھر اور گاؤں کے باہر جمع ہو گئے اور شہید کی واپسی کی راہیں دیکھنے لگے۔ 8 اگست کی صبح جب اس کا جسد خاکی چکلالہ پہنچا تو اس کا دیرینہ دوست کیپٹن انعام پھولوں کے ہار لئے اس کے استقبال کے لئے موجود

تھا۔کیپٹن انعام نے کفن کھولا اور اپنے جیک کا ماتھا چوما اور پھر گاڑیوں کا ایک مختصر قافلہ اس کے گاؤں کی جانب روانہ ہوگیا۔آج وہ بڑی خاموشی سے گھر کی جانب چلا تھا۔آج وہ گوجر خان بھی نہ رکا جہاں اکثر کھڑے ہوکر وہ شمال کی طرف دیکھتا اور اپنی بہن سے کہتا آپا اس طرف کہیں عباس کا گاؤں ہے۔آج وہ اپنے پیارے دوست عباس کے گاؤں جانے کی خواہش ظاہر کئے بغیر ہی گوجر خان سے آگے چل دیا۔

ادھر جاوید اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو گاؤں میں بھی ایک عجیب سماں تھا۔مسلسل بارش کے باوجود ہزاروں لوگ اس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔اس کے والدین، بھائی، بہنیں، عزیز، رشتہ دار انگلینڈ سے جبکہ ہیون آف دی ہیونز کے جوان افسر اور آرٹلری کمانڈر کوئٹہ سے آکر کئی گھنٹوں سے اس کی آمد کے منتظر تھے۔انسانوں کا یہ جم غفیر دیکھتے ہوئے کسی نے مشورہ دیا کہ گاؤں سے باہر پرانے قبرستان میں شہید کی تدفین کا بندوبست کیا جائے چونکہ اتنے لوگوں کا گاؤں کے اندر سمانا مشکل تھا۔فوراً ہی علاقہ کے معززین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور سب کے متفقہ فیصلے کے بعد جگہ کا چناؤ ہوا۔قبر کی یہ جگہ عین وہی مقام تھا جہاں ایک ماہ قبل جاوید اور شہریار کچھ وقت کے لئے رکے تو جاوید وہاں لیٹ گیا اور اپنے بھانجے سے کہنے لگا شیر اس جگہ کتنا سکون ہے۔اس مٹی میں کتنا حسن اور یہاں کیسی خوشبو ہے۔ آج وہ اس مٹی کے حسن کو مزید نکھارنے اور اس کی مہک میں اپنے خون کی مشک ملانے خود ہی آ رہا تھا۔وہ دن کے بارہ بجے اپنے دادا کی حویلی میں آیا تو ہر آنکھ سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔اس کی ماں اور بہنوں نے اپنے لاڈلے بیٹے اور بھائی کا ماتھا چوما۔آج وہ اس حویلی کا مالک نہیں بلکہ مہمان تھا۔جسے جلد ہی چلے جانا تھا۔آج پہلی بار وہ وردی پہن کر اپنے گھر آیا تھا۔جب سب نے اس سجیلے کپتان کا دیدار کر لیا تھا تو کیپٹن انعام نے اپنی یونٹ کے جوانوں کو حکم دیا کہ رجمنٹ کے اس ہیرو کو گاؤں سے باہر کھلے میدان میں لے چلیں جہاں اس کا کمانڈنگ آفیسر کرنل یعقوب اس کے دوست میجر شاہد، کیپٹن دلاور اور درجنوں افسر اور جوان اس سے ملنے کے لئے بیتاب کھڑے تھے۔اس کا کمانڈر جس نے کوئٹہ سے چلتے وقت بڑی دیر تک اس کے ساتھ فلسفہ شہادت پر مفصل گفتگو کی تھی آج خود اس شہید کو الوداع کہنے آیا تھا۔ میجر خضر الرحمٰن، کیپٹن ندیم اور صوبیدار ارشد سوار اپنی نگرانی میں اپنے عزیز کی جائے سکون تعمیر کرنے میں مصروف تھے کہ جاوید اپنی رجمنٹ کے چاک و چوبند جوانوں کے کندھوں پر سوار بڑی شان سے اس محفل خاص میں پہنچا۔فوجی جوانوں نے سلیقے سے صفیں باندھیں۔ہیون آف دی ہیونز کے خطیب اعلیٰ

نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسی رجمنٹ کے چاک و چوبند دستے نے بگل کی آواز پر اپنے ہیرو کو آخری سلام پیش کیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ لحد میں اتارا جانے والا تابوت کیپٹن جاوید کا ہے۔ مگر میجر شاہد، کیپٹن انعام، کیپٹن دلاور اور کیپٹن اشتیاق کے سوگوار چہرے اور دور سے آنیوالی اس کی بہن کی مدھم آواز "جاوید' جاوید" اس سکوت کو بار بار توڑتی اور اس شک کو یقین میں بدل دیتی کہ جاوید واقعی ہی رخصت ہو چکا ہے اور زندہ جاوید ہو گیا ہے۔

7 جولائی 1999ء دن کے تقریباً ڈیڑھ بجے جب دشمن نے اپنے توپخانے کا فائر کھولا تو یوں محسوس ہوا جیسے چھ، بارہ یا اٹھارہ نہیں بلکہ ہزاروں توپیں اور ملٹی بیرل راکٹ لانچر اپنی بھرپور قوت کا مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ ہر طرف دھویں کے بادل اور بارود کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں تھا جس پر کوئی بم نہ گرا ہو۔ اسی اثناء میں مجھے وائرلیس پر پیغام ملا کہ ربانی پوسٹ پر دیدبانی کے فرائض سرانجام دینے والے ہیرو کیپٹن خلیل نے اس گولہ باری کے دوران جام شہادت نوش کیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی مجھے چند روز قبل ہونے والی اس ملاقات کے مناظر دکھائی دینے لگے اور کیپٹن خلیل کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آنے لگیں جب ہم دونوں گن پوزیشن پر اکٹھے ہوئے اور پھر دوسرے ہی روز ہم اپنی اپنی پوسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

کیپٹن خلیل کی پوسٹ ربانی۔۲ ایک ایسی سطح مرتفع تھی جہاں سے دشمن کی ساری نقل و حرکت نظر آتی تھی اور جونہی دشمن آگے بڑھنے کی کوشش کرتا وہ ہمارے فائر کی زد میں آجاتا۔ اس حالت میں دشمن کے پاس دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ اپنا ارادہ ترک کردے اور اس سیکٹر سے آگے نہ آئے یا پھر اپنی بھرپور قوت لگا کر ربانی۔۲ کو تباہ کردے۔ کیپٹن خلیل کی شہادت کے بعد چند روز تک اس علاقہ میں خاموشی چھا گئی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیپٹن خلیل کی جگہ کون لے گا اور کون اس دلیری اور بہادری سے دشمن کی طرف سے برسائی جانے والی آگ کا سامنا کرے گا کہ خبر ملی کے تین آفیسر یونٹ کے ساتھ ڈیوٹی کیلئے آئے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی آگے جائے۔ جب میں نے ان آفیسروں کے نام معلوم کئے تو ان میں ایک نام کیپٹن راجہ جاوید اقبال کا بھی تھا جن سے میری ملاقات سکول آف آرٹلری نوشہرہ میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں ابتدائی کورس کررہا تھا جبکہ کیپٹن جاوید اقبال آرمی سروسز کور سکول میں ایم ٹی او کورس کررہے تھے۔ وہ شام کے وقت آرٹلری مس میں آتے جہاں ان کے دوستوں کا ایک پورا گروپ اکٹھا ہوتا اور سب مل کر محفل گرم کرتے۔ کیپٹن جاوید دوستوں کی اس محفل کی روح تھے۔ وہ ہمیشہ اچھی اور دانائی والی باتیں کرتے جس سے ہر شخص کچھ نہ کچھ حاصل کرتا۔ ان کی باتوں میں ایک خاص چاشنی تھی۔ وہ وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور جو بھی بات کرتے اس میں وزن ہوتا۔

میں اور کیپٹن جاوید اقبال آزاد کشمیر کے ایک ہی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ کیپٹن جاوید انگریزی کے علاوہ صرف پہاڑی زبان جو ہماری مادری زبان ہے کچھ آسانی سے بول سکتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر مجھ سے ملتے رہتے۔ کورس سے متعلق میری رہنمائی کرتے اور ہم کچھ دیر اکٹھے رہتے۔ جب مجھے پوسٹ پر رہتے ہوئے کیپٹن جاوید کی آمد کا پتہ چلا تو میں نے کوشش کی کہ کسی طرح ان سے بات کروں مگر دشمن کی طرف سے گولہ باری کی شدت اور پھر موسم کی خرابی کی وجہ سے میری ان سے بات نہ ہوسکی۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ میں کسی طرح ان سے مل لوں مگر فی الحال یہ بھی ممکن نہ تھا۔ 16 جولائی 1999ء کو پتہ چلا کہ کیپٹن جاوید نے کیپٹن خلیل کی جگہ ربانی پوسٹ پر جانے کے لئے والنٹیئر کیا ہے اور وہ رجمنٹ ہیڈ کوارٹر سے گن پوزیشن کی طرف چل پڑے ہیں۔ یہ سفر راستے کی دشواری اور سطح سمندر سے بلندی کی وجہ سے تین روز کا تھا اور آگے جانے والے لوگ اکثر راستے میں تین راتیں گزار کر چوتھے دن منزل پر پہنچتے تھے مگر کیپٹن راجہ جاوید اقبال جیسے جسمانی لحاظ سے انتہائی چاک و چوبند اور چیتے جیسے پھرتیلے آدمی کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ موسم اور سفر کی دشواری کو اپنے اور اپنی منزل کے بیچ حائل ہونے دیتا۔ ہمیشہ ہنسنے مسکرانے اور حیران کر دینے والے اس فٹ بالر نے آج پھر سب کو حیران کرتے ہوئے اسی روز ربانی پوسٹ سے فون کیا کہ میں منزل پر پہنچ گیا ہوں اور پھر گن پوزیشن پر فون کیا اور دشمن کی طرف چند گولے پھینکوا کر دوسری جانب بھی پیغام دے دیا کہ خلیل کی شہادت کے بعد جو سکوت پیدا ہوا تھا وہ عارضی تھا۔ لو اب میں آ گیا ہوں۔ ۲۸ جولائی کی رات مجھے اپنی پوسٹ سے تبدیل کر دیا گیا اور ۳۰ جولائی کی رات گن پوزیشن پر پہنچنے کا حکم ملا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس گن پوزیشن سے ہی کیپٹن جاوید فائر حاصل کرتے اور چُن چُن کر دشمن کو واصل جہنم کرتے تھے۔ کیپٹن جاوید انتہائی ذہین اور حاضر دماغ گنر تھے ان کا فائر اتنا درست اور کارگر ہوتا کہ دشمن کے لئے ایک انچ آگے بڑھنا ممکن نہ ہوتا۔ ۳۰ جولائی سے ۵ اگست تک ہمارا ایک بار پھر رابطہ بحال ہو گیا۔ ہم نہ صرف دشمن کی کوششوں کو خاک میں ملاتے بلکہ ٹیلی فون پر گپ شپ بھی کرتے رہتے۔ باتوں ہی باتوں میں کیپٹن جاوید فائر بھی مانگ لیتے اور بالکل محسوس نہ ہوتا کہ وہ میدان جنگ میں بیٹھے ہیں یا اپنے گھر کے ڈرائینگ روم میں۔ جب دشمن کا بھاری فائر ہو رہا ہوتا اور لائن بھی ٹھیک ہوتی تو وہ اسی طرح باتیں کرتے رہتے اور ہنستے رہتے۔ انہوں نے کئی بار کہا اشتیاق میں نے واپس نہیں آنا۔ ربانی میری آخری منزل ہے جتنی باتیں

کرنی ہیں کرلو۔ دشمن کا فائر ہے تو نا کارہ مگر کسی ایک گولے کے ٹکڑے پر میرا نام لکھا ہے۔ میں کہتا سر مذاق نہ کریں یہ تو آپ نے والینٹیئر کیا ہے اورادھرآ گئے ہیں ورنہ آپ نے تو کسی اور جگہ جانا تھا۔ کیپٹن جاوید کہتے اور جگہ کیسے جا تا میرے لئے تو یہی جگہ لکھی ہے میں نے یہاں ہی آنا تھا وہ پھر کہتے اشتیاق یہ جگہ بڑی خوبصورت ہے اس مٹی میں بڑا رومانس ہے شائد اسی لئے دشمن ہر حال میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

جب سے کیپٹن جاوید ربانی پوسٹ پر آئے تھے دشمن نے توپخانے کے علاوہ ہوائی حملے بھی شروع کر دیئے تھے۔ دشمن ہمارے موثر اور کارگر فائر کی وجہ سے پاگل ہوا جارہا تھا اور سارا سارا دن اور بعض اوقات رات بھر بھی فائر کرتا رہتا۔ دوسری جانب دشمن کو گولہ باری اور ہوائی حملوں کا سامنا کرنے والے کیپٹن راجہ جاوید اقبال اور ان کے دو تین ساتھی کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے کمال جرأت اور بیبا کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کے حملوں کو مسلسل نا کام بنارہے تھے۔ اس پوسٹ پر صرف ایک ایگلو تھا جو صرف موسم کی شدت میں کمی لاسکتا تھا یہ ایگلو توپوں کے گولوں اور جہازوں کے بموں اور راکٹوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ جب دشمن کا فائر آتا تو کیپٹن جاوید اوران کے ساتھی چٹانوں کی آڑ میں چلے جاتے اور دشمن کے فائر کی سمت محسوس کرتے ہوئے آڑیں بدلتے رہتے اس طرح جب وہ دشمن پر فائر نہ کروا رہے ہوتے تو خود جگہ بدل بدل کر اپنی حفاظت کا عارضی بندوبست بھی کرتے۔ ان حالات میں گھبرانے کے بجائے کیپٹن جاوید اکثر کہتے اشتیاق پتہ نہیں دشمن کو کون بتا دیتا ہے کہ ہمارے سونے اور کھانے کی جگہ کون سی ہے اور ہم کس چٹان کے نیچے رات گزاتے ہیں۔ چونکہ اگلے روز اس پر گولہ ضروری لگتا ہے۔

۵۔ اگست کی صبح 9 بجے کیپٹن جاوید نے فائر مانگا تو میں نے کہا سر اتنی جلدی کیا ہے جواب ملا لگتا ہے آج کچھ ہونے کو ہے۔ آج دشمن کچھ زیادہ ہی اسمارٹ لگ رہا ہے تم بھی اسمارٹ ہو جاؤ۔ یہ میری زندگی کا ایک نہ بھولنے والا دن ہے اور شاید توپخانے کی تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم اور سنہری دن بھی۔ کیپٹن جاوید چند میٹر دائیں اور بائیں اور اس طرح چند میٹر آگے اور پیچھے کی درستگی مانگ رہے تھے۔ گو کہ میری عمر اور تجربہ کم ہے مگر شاید ہی توپخانے کی تاریخ میں ایسا ہوا ہو کہ کسی آبزرور (دیدبان) نے اتنا پیچیدہ درست اور کارگر فائر کروایا ہو۔ آج ہم کمپیوٹر کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ مگر اتنی باریکی سے

فائر گرانا آسان نہیں۔ یہ صرف کیپٹن جاوید ہی کا ذہن اور ہمت تھی جنہوں نے آخری دم تک دشمن کو چُن چُن کر مروایا اور اس کے بڑے منصوبے اور تیاری کو آن واحد میں خاک میں ملا دیا۔

دوسری جانب دشمن کا توپخانہ بھی پوری ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور انچ انچ پر لوہا اور آگ برسا رہا تھا۔ دونوں جانب سے توپوں کی گن گرج نے قیامت کا سماں بر پا کیا ہوا تھا۔ ہر سمت دھواں ہی دھواں تھا اور بم گرنے اور پھٹنے سے زمین ہل رہی تھی۔ قیامت کے اس لمحے میں اچانک کیپٹن جاوید کی آواز آنا بند ہوگئی تو ہم سمجھے کہ شاید ٹیلی فون کی لائن کٹ گئی ہے۔ میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ان کے آخری الفاظ یہی تھے کہ اشتیاق کام جاری رکھو میں واپس نہیں آؤنگا۔ جب کیپٹن جاوید کی آواز نہ آئی تو میں نے ان کی ہدایت کے مطابق سویپ اینڈ سرچ فائر جاری رکھا۔ یہ فائر کیپٹن جاوید کی طرف سے ملنے والے ڈاٹا کے مطابق تھا جس کی وجہ سے دشمن کو بھاری نقصان ہوا۔

جب دشمن کی طرف سے فائر بند ہوا تو میں نے کوشش کی کہ کسی طرح کیپٹن جاوید سے رابطہ ہو اور ان کی خیریت معلوم ہو سکے مگر ان کا ٹیلی فون اور وائرلیس خاموش تھے۔ تقریباً سوا چار بجے مجھے دوسری گن پوزیشن سے اطلاع ملی کہ فائر کے دوران کیپٹن راجہ جاوید اقبال اور ان کے دونوں ساتھی اپنے مقصد کی بجا آوری اور راہ حق میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے تین بج کر پندرہ منٹ پر جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ یہ خبر میرے لئے انتہائی دکھ اور تکلیف کا باعث تھی۔ آج نہ صرف ایک ماں اپنے بیٹے، بہن اپنے بھائی اور دو معصوم بچے اپنے نوجوان باپ سے بلکہ ملک ایک نڈر سپوت سے اور کور آف آرٹلری ایک ذہین اور انتہائی قابل لیڈر اور آفیسر سے محروم ہو گئے۔ کیپٹن جاوید جیسے نیک سیرت، جفاکش اور باجرأت انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ انگلینڈ کے شہر لوٹن میں پیدا ہوئے تھے اور وہی پلے اور بڑھے تھے۔ انہیں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ اپنی بڑی بہن جو کہ لیفٹیننٹ کرنل راجہ محمد ایوب جن کا تعلق 9 آزاد کشمیر رجمنٹ سے ہے کی بیگم ہیں سے پیار تھا۔ وہ اپنی بہن سے اتنی چاہت رکھتے تھے کہ ان کے قریب رہنے کے لئے وہ پاکستان آئے اور پھر آتے ہی فوج میں شامل ہو گئے۔ کیپٹن جاوید کی زندگی کا واحد مقصد جہاد اور شہادت تھا۔ آرٹلری مس نوشہرہ میں وہ جب بھی بیٹھتے ان کی گفتگو کا محور جہاد ہی ہوتا۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید تمغہ بسالت کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے جن کی ہر

خواہش پوری ہوتی ہے۔ وہ ایک امیر اور علاقہ کے معتبر خاندان میں پیدا ہوئے۔ اپنا بچپن اور جوانی کے ابتدائی ایام یورپ میں گزارے اور بہترین سکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں کمپنی سینئر انڈر آفیسر بنے اور کورس کے چند چنے ہوئے آفیسروں کی لسٹ میں پاس آوٹ ہوئے۔ یونٹ میں رہتے ہوئے کھیلوں میں نام پیدا کیا اور اپنی کور کی جانب سے آرمی میں فٹ بال کھیلا۔ انہوں نے جتنے بھی پروفیشنل کورس کئے ان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیشہ اوّل پوزیشن حاصل کی۔ فوج میں شامل ہوکر اپنی بہن اور والدین کی خواہش کے مطابق جلد ہی شادی کرلی اور خدا نے انہیں دو بیٹوں کی نعمت سے بھی نوازا۔

اپنی خواہش کے مطابق میدان جنگ میں آئے اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے شہادت جیسا عظیم مقام حاصل کیا۔ وہ لوگ جو کیپٹن جاوید اقبال شہید کا جسد خاکی اٹھانے ربانی پوسٹ پر گئے کا بیان تھا کہ صرف ایک ہی آدمی نے کیپٹن جاوید اقبال شہید کو اٹھایا اور اپنے کاندھے سے لگا کر نیچے لے آیا۔ کیپٹن جاوید کا قد چھ فٹ تھا اور ان کا جسم کسرتی اور انتہائی چاک و چوبند تھا۔ وہ فٹ بال کے کھلاڑی تھے اس کے علاوہ کرکٹ، ہینڈ بال اور ہاکی بھی بہترین انداز میں کھیلتے تھے۔ اتنا صحت منداور پھرتیلا نوجوان جب اپنی گردن راہ حق میں کٹا بیٹھا اور جس مقصد کے لئے وہ یورپ کی رنگینیاں ترک کرکے مادر وطن کو سلام کرنے آیا تھا آج وہ مقصد پورا ہوگیا تو اس کا جسم معصوم بچے کی مانند ہلکا پھلکا ہوگیا۔ وہ جوان جو انہیں اٹھا کر لائے کہتے تھے کہ ان کے خون سے عجیب خوشبو آرہی تھی۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید کو جب سکردو لایا گیا تو میں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ضیاءُ الحق سے خصوصی درخواست کی کہ مجھے شہید کے ساتھ ان کے گاؤں تک جانے دیا جائے چونکہ اس مجاہد سے میری پرانی واقفیت تھی مگر کبھی مل بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج جب میری دھرتی کا یہ سپوت ایک نئی شان سے قیام قیامت تک ہم سے بچھڑنے والا تھا تو مجھے یہ اعزاز بخشا جائے کہ میں اس کی قبر پر اپنی یونٹ کی طرف سے پھول نچھاور کروں۔

کرنل ضیاءُ الحق نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے مجھے شہید کی ہم سفری کا موقع دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ جس خوشبو کا ذکر گن پوزیشن پر ہوا تھا اس کی مہک وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ جب ہم چکلالہ سے گاؤں کی طرف جارہے تھے تو ایمبولینس کے علاوہ دو تین اور گاڑیاں جو شہید

کے استقبال کے لئے آئی تھیں بھی اس مختصر قافلے میں شامل ہوگئیں۔ جب ہم میر پور پہنچے تو کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید کے ننھیال سے جو میر پور کے قریب کھڑی شریف میں ہے سے کئی گاڑیاں اس متبرک جلوس میں شامل ہوگئیں۔ چکلالہ سے میر پور اور پھر پیر گلی کے مقام تک آہستہ آہستہ بارش جاری رہی اور موسم بھی انتہائی خوشگوار تھا مگر جب ہم پیر گلی سے وادی کالا ڈب میں داخل ہوئے تو سفید دودھیا بارش شروع ہوگئی جو کہ شدت کے باوجود ایک عجیب نورانی منظر پیش کر رہی تھی۔ کالا ڈب کے مقام پر ہزاروں لوگ شہید کے استقبال کے لئے موجود تھے مگر کسی کو بارش میں بھیگنے کا احسان نہیں تھا۔ اس بارش کے باوجود جب ہم کالا ڈب پہنچے تو شہید کے جسم سے آنے والی خوشبو اور تیز ہوگئی اور لوگوں کو اس خوشبو کے پھیل جانے سے ہی پتہ چل گیا کہ شہید کا جسد خاکی پہنچ گیا ہے۔ کیپٹن جاوید اقبال ۵۔ اگست 1999ء دن کے سوا تین بجے بٹالک سیکٹر کی ربانی پوسٹ پر شہید ہوئے اور 8۔ اگست 1999ء دن کے سوا تین بجے میر پور سے کھوئیرٹہ جانے والی سڑک کے قریب دبلہاہ راجگان کے قدیم قبرستان میں حضرت مائی نوشہؒ کے دربار کے قریب پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کر دیئے گئے۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید کے جنازے میں بھی عجیب سماں تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان سے نور برس رہا ہو۔ ہر طرف ایک پر لطف خوشبو تو تھی ہی مگر جونہی کفن ایمبولینس سے نکالا گیا تو اچانک بارش بھی رک گئی۔ جنازے کے بعد جب دیگر رسومات پوری ہو چکیں اور کوئٹہ سے آنے والے کمانڈر آرٹلری شہید کی قبر پر سلامی پیش کرنے کے بعد اپنی جیب میں بیٹھے تو بارش پھر شروع ہوئی اور موسم پھر سے ٹھنڈا اور خوشگوار ہو گیا۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید کی گردن پر آرٹلری شیل کا جو ٹکڑا لگا تھا اسے شہید کا جسد لانے والی پارٹی ساتھ ہی اٹھا لائی تھی۔ یہ ٹکڑا مجھے کسی نے دیا تھا جو میں نے دفناتے وقت قبر میں شہید کے تابوت کے سرہانے رکھ دیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی اور بار بار میرے دل میں یہ کیوں آ رہا تھا کہ یہ بھی کیپٹن جاوید ہی کی امانت ہے۔ یہ ٹکڑا جس کا وہ بار بار ذکر کرتے تھے کہ اشتیاق گو کہ ہم کھلے آسمان کے نیچے ہیں مگر بم کے جس ٹکڑے پر میرا نام لکھا ہے وہ ابھی تک فائر نہیں ہوا۔ یہی وہ فولادی ٹکڑا تھا جس پر اس شہید کا نام لکھا تھا اور میں نے اسے اس کی امانت سمجھ کر اس کے سرہانے رکھ دیا۔ کیپٹن جاوید جس قبرستان میں دفن ہیں اس سے تقریباً دوسو گز کے فاصلے پر ایک مکان ہے جو کہ ان کے والد محترم کے مکانوں میں سے ایک ہے۔ ان کے دوستوں کے مطابق وہ واپسی پر اس مکان کی جگہ ایک بنگلہ تعمیر کرنے والے تھے مگر قدرت نے انہیں اس کی مہلت نہ

دی۔کیپٹن جاوید خود تو اپنے لئے بنگلہ تعمیر نہ کر سکے مگر ان کے والد نے اپنے بیٹے کی قبر پر سنگ مرمر سے مزین ان کا مزار تعمیر کیا ہے جو ہر راہ گیر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور انسان کا دل خود ہی اس طرف مائل ہو جاتا ہے کہ اس مکان کے مکین سے بھی ملا جائے۔کیپٹن جاوید ایک خوش قسمت انسان تھے۔انہوں نے مختصر مگر بھرپور زندگی گزاری اور آج شہادت کے بعد سینکڑوں لوگ ہر روز ان کے مزار پر رکتے اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا مانگتے ہیں۔

کیپٹن اشتیاق احمد گورسی

15 مئی 2001ء لاہور

یہ اپریل 1994ء کی ایک صبح کا واقعہ ہے کہ ایڈ جوٹنٹ نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور بتایا کہ آج ہماری یونٹ میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے پاس آوٹ ہوکر دو نئے سیکنڈ لیفٹیننٹ آ رہے ہیں۔اور میں نے یونٹ کی طرف سے ان کا استقبال کرنا ہے۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دونوں نئے آنے والے افسروں میں سے ایک افسر سیکنڈ لیفٹیننٹ شجاع اسحاق نے یونٹ کو اپنے آنے کے وقت سے مطلع کیا ہوا تھا جبکہ دوسرے افسر سیکنڈ لیفٹیننٹ راجہ جاوید اقبال نے کوئی اطلاع نہیں کی تھی۔میں اس شش و پنج میں تھا کہ دوسرے افسر کو کب اور کہاں سے لاؤں گا۔میں نے اس مسئلہ کا ذکر ایڈ جوٹنٹ سے کیا لیکن اس کے پاس بھی کوئی اطلاع نہیں تھی۔آخر طے یہ پایا کہ مقررہ وقت پر میں اسٹیشن جا کر سیکنڈ لیفٹیننٹ شجاع کو لے لوں اور پھر ادھر ہی سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید کا انتظار کروں اور ان دونوں کو لے کر یونٹ پہنچوں ۔ یہ پروگرام فائنل کرنے کے بعد میں آفس سے باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے ایک کار کو یونٹ گیٹ سے اندر آتے ہوئے دیکھا۔کار رکی تو اس میں سے بلیک جینز اور بلیو شرٹ میں ملبوس ایک خوبصورت اور ہینڈسم نوجوان باہر نکل کر میری طرف آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا" سر "میرا نام سیکنڈ لیفٹیننٹ راجہ جاوید اقبال ہے اور میری پوسٹنگ اس یونٹ میں ہوئی ہے۔میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہم تو اس کا استقبال کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن یہ خود ہی یونٹ میں بھی پہنچ گیا ہے۔اس طرح افسر بنتے ہی اور یونٹ میں اپنے پہلے دن ہی جاوید نے ہمیں سرپرائز دے دیا۔

اس دن نئے افسر سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید کو یونٹ میں چھوڑنے کے لئے ان کی والدہ محترمہ، ہمشیرہ (مسز کرنل راجہ ایوب) اور اس کے ایک کزن راجہ ذوالقرنین بھی ساتھ آئے تھے۔یونٹ ٹی بار میں چائے وغیرہ سے تواضع کرنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ میس چلیں اور لنچ کرنے کے بعد جائیں۔لیکن والدہ محترمہ اور ہمشیرہ نے کہا کہ چونکہ ہم نے واپس جانا ہے اور ہمیں دیر ہوجائے گی اس لئے ابھی ہم فوراً جائیں گے۔اس کے بعد والدہ اور ہمشیرہ بڑے لاڈ و پیار سے جاوید سے ملیں اور اسے پیار کیا۔پھر جاوید اپنے کزن سے گلے ملا اور چند ضروری باتوں کے بعد وہ لوگ رخصت ہوگئے۔

میں جاوید کو ساتھ لے کر اسلام آباد سے آنیوالے دوسرے افسر شجاع کو لینے کے لئے اسٹیشن چلا گیا۔مقررہ وقت پر گاڑی آئی تو ہم نے اس میں سے اترنے والے مسافروں میں شجاع کو دیکھنا شروع کیا۔ میں چونکہ یونیفارم میں تھا اور میرے ساتھ جاوید بھی تھا جو کہ شجاع کا کورس میٹ تھا اور دونوں نے اکیڈمی میں اکٹھے ٹریننگ حاصل کی تھی اس لئے ہمیں شجاع کو اور شجاع کو ہمیں پہچاننے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ تعارف کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ہم تینوں یونٹ واپس آ گئے۔

فوجی دستور کے مطابق اکیڈمی سے ٹریننگ حاصل کر کے یونٹ میں نئے آنے والے دونوں افسروں کو آرمی لائف اور یونٹ روٹین سے روشناس کروانے کے لئے میری ڈیوٹی لگائی گئی اور اس مقصد کے لئے دونوں افسروں کو میس پر ٹھہرانے کے بجائے چند دن کے لئے یونٹ میں ہی ٹھہرایا گیا۔ جاوید ایک حاضر دماغ اور ذہین افسر تھا جو بڑی جلدی ہر چیز کو سمجھ جاتا تھا۔ جاوید سے تفصیلی بات چیت کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کی ایک ہمشیرہ کے علاوہ ساری فیملی انگلینڈ میں رہائش پذیر ہے وہ انگلینڈ میں ہی پیدا ہوا تھا اور 1989ء میں پہلی دفعہ پاکستان آیا تھا۔ پاکستان پہنچتے ہی اس نے آرمی کے لئے اپلائی کر دیا جو کہ اس کے پاکستان آنے کا واحد مقصد تھا۔ میں نے جب اس سے یہ پوچھا کہ آپ کی ساری فیملی انگلینڈ میں ہے اور آپ وہاں بہترین مستقبل حاصل کر سکتے تھے تو پھر آپ پاکستان کیوں آئے۔ جاوید نے جواب دیا کہ اسے شروع سے ہی پاکستان آرمی میں آنے کا شوق تھا۔اس کے علاوہ اس کی ہمشیرہ بھی یہاں ہیں اس لئے اس نے پاکستان آرمی جوائن کر لی۔ جاوید کے اس جواب پر میں اکثر سوچتا تھا کہ جس شخص نے ایک ترقی یافتہ اور ماڈرن معاشرے میں جنم لیا ہو۔جدید ماحول میں تعلیم وتربیت حاصل کی ہو اور وہاں اس کے لئے بہتر سے بہترین مستقبل بھی ہو وہ کیونکر یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک ترقی پذیر ملک کی آرمی جوائن کر لیتا ہے۔ جبکہ یہاں کی اکثریت خواہ وہ ان پڑھ ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ کا اکلوتا خواب ہی وہ ملک اور معاشرہ ہے جسے جاوید جہاد کی خواہش اور وطن کی محبت میں پائے حقارت سے ٹھکرا کر چلا آیا۔لیکن اب مجھے اس بات کا جواب مل چکا ہے کہ جاوید کو کس چیز کی کشش کھینچ کر اس ملک میں لے آئی۔اصل میں جاوید کی ابدی منزل یہاں تھی اور یہاں آ کر اس نے زندہ جاوید ہونا تھا۔ جو مقام اور مرتبہ اللہ نے اس کیلئے لکھا تھا اس کا حصول برطانیہ میں رہ کر ممکن نہ تھا۔

یونٹ میں تقریباً اڑھائی یا تین ماہ گزارنے کے بعد جاوید اپنے ابتدائی کورس کے لئے نوشہرہ

روانہ ہوگیا اور وہاں سکول آف آرٹلری سے اس نے کورس میں اعلیٰ ترین گریڈ حاصل کیا۔ کورس سے واپسی کے بعد جاوید مزید میچور اور ذمہ دار ہو چکا تھا۔ چند دنوں کے بعد لیفٹیننٹ کے رینک پر اس کی ترقی ہوگئی۔ یونٹ کے تمام پروفیشنل اور کھیلوں کے مقابلوں میں اس نے یونٹ کی نمائندگی کی اور یونٹ کو ہمیشہ اعلیٰ پوزیشن دلوائی۔ جسمانی طور پر جاوید فٹ اور چاق و چوبند تھا۔ خصوصاً وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ جاوید اور میں دونوں یونٹ کی فٹ بال کی ٹیم کے ساتھ پریکٹس کرتے تھے میں تو آدھے کھیل کے بعد ہی سائیڈ پر ہوجاتا تھا۔ جبکہ وہ لگاتار کھیلتا رہتا تھا۔ کمرے میں آکر ہم دونوں ایک دوسرے کو دباتے تھے تاکہ ہمارے مسلز ریلیکس ہوجائیں۔

جاوید ایک پرمزاح اور ہنس مکھ افسر تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اس طرح مذاق کرجاتا تھا کہ کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ اگلا آدمی اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ میں نے چونکہ اسے پہلے دن یونٹ میں ریسیو کیا تھا اور اس کی ابتدائی تربیت بھی کی تھی اور اس کے علاوہ حسن اتفاق سے اس کی پوسٹنگ بھی میری بیٹری میں ہی ہوئی تھی اور اس لئے میرے ساتھ وہ کچھ زیادہ ہی فری تھا۔ اتفاق سے لیفٹیننٹ سے کیپٹن کی ترقی کے لئے میرا، توصیف، شجاع اور جاوید کا انٹرویو اکٹھا ہوا۔ ہمارا کمانڈر سخت گیر مشہور تھا اور امید نہیں تھی کہ وہ ہم سب کی ترقی کرے گا۔ لیکن خلاف توقع اس نے ہم سب کو اکٹھے ترقی دے دی۔ انٹرویو سے واپسی کے بعد یونٹ میں آکر جاوید نے سب آفیسرز کو میرے متعلق یہ بات بتائی کہ سر نعیم نے ہاتھ جوڑ کر کمانڈر سے کہا تھا کہ خدا کے لئے ہمیں پروموٹ کردو اس لئے کمانڈر نے ہمیں پروموٹ کیا ہے۔ شجاع کے بارے میں اس نے یہ کہا کہ یہ تو کمانڈر کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

جاوید کو خوبصورت لباس پہننے کے ساتھ ساتھ اچھا کھانا کھانے کا بھی شوق تھا۔ عموماً ہر ہفتے ہم تمام بیچلرز فورٹریس سٹیڈیم میں واقع بندو خان ریسٹورنٹ میں پہنچ جایا کرتے تھے جہاں ہماری پسندیدہ ڈش شاشلک اور بھنا ہوا مغز ہوتی تھی۔ مزاحاً جاوید کہتا تھا کہ انسان کو وہ چیز زیادہ کھانی چاہئے جس کی اس میں کمی ہو اور شاید ہم میں مغز کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ جاوید کو چائنیز کھانے کا بھی شوق تھا اس کے لئے ہم نے گلبرک میں ایک ریسٹورنٹ ڈھونڈ رکھا تھا۔ ہم سب نے مل کر اپنی پروموشن کی پارٹی اور جاوید نے اپنی شادی کا ڈنر بھی اسی چائنیز ریسٹورنٹ میں دیا۔ جب جاوید کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا کیا تو ہم نے اسے کہا کہ وہ اس کا نام جیک جونیئر رکھ دے کیونکہ عام طور پر سب دوست احباب جاوید کو جیک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایک غیر اسلامی ملک اور بے راہ روی سے شکار معاشرے میں پرورش پانے کے

باوجود جاوید اسلامی قدروں پر سختی سے عمل کرنیوالا انسان تھا جس کا سہرا اس کے والدین کے سر تھا جنہوں نے اس کی تربیت اس طرح کی کہ اسلام اس کی رگوں میں رچ بس گیا اور وہ نماز روزے کا پابند رہا اور آخر کار شہادت اس کی منزل بن گئی۔ جاوید کو تصوف اور روحانیت سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ جب اس موضوع پر میری اس سے بات چیت ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ ایبٹ آباد میں ایک بزرگ ہیں جن کا نام صوفی محمد نورالدین اویسی صاحبؒ ہے اور وہ صوفی صاحب سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ان بزرگ سے اس کا رابطہ خط و کتابت کے ذریعے تھا۔ چونکہ جاوید کی اردو کمزور تھی اس لئے یہ خط و کتابت انگلش میں ہوتی تھی میں نے جاوید کے ساتھ پروگرام بھی بنایا تھا کہ کسی روز ہم دونوں ایبٹ آباد جا کر اس ہستی سے ملاقات کریں گے لیکن افسوس کہ فوجی زندگی میں مصروفیات کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ صوفی صاحبؒ کی روحانی تربیت کا صلہ تھا کہ جاوید روحانیت اور تصوف پر بات کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہم ایک نوجوان کپتان کے سامنے نہیں جبکہ روحانیت کے کسی بڑے مفکر اور دانشور کے سامنے بیٹھے ہیں۔ جاوید نماز کے ساتھ ساتھ مراقبہ بھی کرتا اور باقاعدگی سے صوفی صاحبؒ کا بتایا ہوا درود اویسی بھی پڑھتا۔ جاوید کے پاس تسبیح ہمیشہ رہتی اور شہادت کے وقت بھی یہ تسبیح اس کی جیب ہی میں تھی۔

1997ء میں میری پوسٹنگ سیاہ چن ہوگئی اور اسی سال ہماری یونٹ بھی لاہور سے کوئٹہ پہنچ گئی۔ جب میں سیاہ چن سے چھٹی آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئٹہ سے کیپٹن دلاور اور جاوید کورس کرنے نوشہرہ آئے ہوئے ہیں۔ میں ان سے ملنے نوشہرہ گیا تو اس وقت جاوید ایم ٹی کورس کر رہا تھا۔ وہ مجھے بڑی خوشدلی سے ملا اور اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ جولائی 1998ء میں میرا بھی نوشہرہ میں کورس آ گیا اور جب میں سیاہ چن سے سکول آف آرٹلری نوشہرہ پہنچا تو اچانک پھر میری ملاقات جاوید سے ادھر ہی ہوئی۔ وہ اس وقت لوکیٹنگ کورس کر رہا تھا۔ ہم دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے اور تقریباً دو ہفتے روزانہ ہماری ملاقات ہوتی رہی۔ اس کے بعد دوبارہ جاوید کی پوسٹنگ کوئٹہ ہوگئی اور وہ آخری بار مجھ سے مل کر کوئٹہ روانہ ہوگیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ کوئٹہ میں گاہے بگاہے فون پر میری جاوید سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ لاہور سے جب پہلی دفعہ جاوید اپنے والدین سے ملنے انگلینڈ گیا تھا تو واپسی پر اس نے مجھے ایک خوبصورت پرس کا تحفہ دیا تھا۔ ایک دن جب کوئٹہ میں میری اس سے فون پر بات ہو رہی تھی تو میں نے اسے یاد دلایا کہ میرے پاس اس کی ایک نشانی ہے تو اس نے کہا کہ سر اب

جب میں انگلینڈ جاؤں گا تو آپ کے لئے ایک اور پرس لے کر آؤں گا لیکن وہ انگلینڈ جانے کے بجائے آخرت کے سفر پر روانہ ہو گیا!

جس دن مجھے جاوید کی شہادت کے متعلق علم ہوا اس وقت تک اسے شہادت کا مرتبہ حاصل کئے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ سردیوں کی ایک دوپہر کور رینجرز ہیڈ کوارٹر ناروال میں بیٹھا ہوا میں افواج پاکستان کے نمائندہ رسالے "ہلال" کو سرسری نظر سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک صفحہ پر جم کر رہ گئی۔ اس صفحہ پر مجھے کیپٹن جاوید کی ہنستی مسکراتی ہوئی تصویر نظر آئی لیکن تصویر کے ساتھ لکھئے ہوئے الفاظ پڑھ کر چند لمحوں کے لئے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میرے دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہو۔ جب میرے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ مضمون پڑھنا شروع کیا جس میں جاوید کی شہادت کی تفصیل دی ہوئی تھی کہ کارگل کے محاذ پر ملک وقوم کے دفاع کے لئے ہیون آف دی ہیونز کے اس شیر نے کس بہادری سے اپنی جان قربان کر دی۔ مضمون پڑھا تو بیتے ہوئے لمحات کی فلم ذہن پر چلنے لگی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ اس وقت میرے ساتھ دوسرے افسر بھی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے آپ اچانک اس طرح افسردہ کیوں ہو گئے ہو؟ تو میں نے انہیں بتایا کہ میرا ایک دوست ایک جونیئر ایک فیملی ممبر کیپٹن جاوید چھ ماہ پہلے کارگل کے محاذ پر شہادت پا چکا ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ مجھے اس کی شہادت کی خبر آج مل رہی ہے انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور سب نے جاوید کے بلند درجات کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

آہستہ آہستہ مجھے قرار آتا گیا کہ جاوید تو زندہ جاوید ہو گیا ہے اس کے ساتھ ہی مجھے اس پر رشک آتا گیا کہ وہ اتنی جلدی اپنی منزل کو پا گیا اور بامراد ٹھہرا۔ لیکن ہم ابھی تک اس حیات پر خار پر الجھے ہوئے ہیں نجانے کب ہمارا نخل تمنا ہرا ہو اور کب جاوید کی طرح ہم بھی اپنے ملک وقوم کے لئے جان قربان کر سکیں۔

اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ وہ جاوید شہید کی شہادت قبول کر کے اس کے درجات بلند فرمائے اور جاوید کی شہادت کے صدقے ہمیں بھی جلد شہادت عطا فرمائے۔ آمین

کیپٹن محمد نعیم سرفراز

18 مئی 2001ء کوئٹہ کینٹ

اپریل ۱۹۹۵ء میں میری پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے آرٹلری کی مایہ ناز یونٹ ہیون آف دی ہیونز میں پوسٹنگ ہوئی تو اس وقت یہ یونٹ لاہور میں تھی۔ میں رات کے وقت یونٹ میں پہنچا تو مجھے آرٹلری میس کے گیسٹ روم میں ٹھہرایا گیا اور بتایا گیا کہ آپ صبح تیار رہنا یونٹ کا کوئی آفیسر آپ کو لینے آئے گا۔ میری خوش نصیبی کہ اگلے روز جو آفیسر صبح سویرے مجھے ملنے آیا وہ کوئی اور نہیں بلکہ لیفٹیننٹ راجہ جاوید اقبال تھے جنہوں نے محبتوں اور مسکراہٹوں کے ساتھ میرا استقبال کیا اور چند ہی منٹوں میں مجھے یونٹ کی تاریخ آفیسروں کے نام اور موڈ اور ان سے ملنے ملانے کے طریقے بتلا دیئے۔ کیپٹن جاوید سے پہلی ملاقات ایک مکمل درس تھا۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے مجھے لاہور کے اہم مقامات کے علاوہ فوجی زندگی کے بہت سے اصول اور ضابطے بھی بتائے اور مجھے اپنے ساتھ یونٹ لے گئے۔

یونٹ کی طرف سے کیپٹن جاوید جو لیفٹیننٹ تھے کو میری تربیت کا ٹاسک بھی دیا گیا جو میرے لئے بہت ہی خوشگوار تجربہ تھا۔ کیپٹن جاوید اردو نہیں بول سکتے تھے اور ہر لفظ سوچ کر اور تول کر بولتے کہ کہیں الفاظ و معنی میں تضاد نہ ہو۔ ان کا اردو نہ بولنا ہمارے لئے اچھا تھا اور اسی بہانے ہماری انگریزی بہتر ہو جاتی۔ کیپٹن جاوید انتہائی ذہین اور زیرک آفیسر ایک قابل اعتماد دوست اور مدبر شخصیت کے مالک انسان تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اگر انہیں کوئی کتاب پسند آتی اور وہ بازار میں دستیاب نہ ہوتی تو کسی سے مانگ کر اس کی فوٹو کاپی کروا لیتے۔ وہ کتابیں بڑے مزے سے اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے اور پھر ان پر نوٹ لکھتے رہتے۔ ہم اکثر کہتے کہ کیپٹن جاوید سے کتاب لیکر اس پر لکھے نوٹ اور تبصرہ پڑھ کر کتاب کا متن سمجھ آ جاتا ہے۔ کیپٹن جاوید کو لاہور کے سارے تاریخی اور تفریحی مقامات کا پتہ تھا۔ کبھی کبھی ہم سب مل کر ان مقامات پر جاتے بھی تھے۔

کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید میرے استاد تھے۔ انہوں نے مجھے فوجی زندگی کے طور اطوار کے علاوہ زندگی کے دیگر مسائل کے متعلق بھی بہت کچھ سکھایا جو کہ عموماً والدین یا بڑے بھائی کا کام ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص کا دکھ درد سمجھتے اور پھر انتہائی سلیقے سے مدد اور رہنمائی کرتے تھے۔ کیپٹن جاوید نے میرے پروفیشنل کورسز کی تیاری میں بھی مدد کی اور مجھے کورس پر جانے سے پہلے ہی اتنا کچھ سکھا دیا کہ کورس میرے

لئے انتہائی آسان ہوگیا۔

کیپٹن جاوید مجھے شاہ جی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ انتہائی چاک و چوبند اور پھرتیلے نوجوان تھے۔ وہ اکثر دومیل کی دوڑ میں اوّل آتے۔ اس کے علاوہ یونٹ کی طرف سے ہر کھیل میں شامل ہوتے۔ کیپٹن جاوید فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے۔ اس کے علاوہ وہ کرکٹ اور ہاکی بھی کھیلتے اور یونٹ ٹیم کے کپتان ہوتے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کی ترقی ہوئی اور وہ کیپٹن بن کر یونٹ ایڈجوٹنٹ بن گئے۔ کیپٹن جاوید ایک سیدھے سادھے۔ حاضر جواب مگر قواعد وضوابط کی پابندی کرنے والے انسان تھے۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا وہ زبان پر بھی ہوتا۔ وہ سب کے ساتھ یکسانیت اور سچائی پر مبنی تعلقات رکھتے۔

کوئٹہ پہنچ کر کیپٹن جاوید اقبال کورس کے لئے نوشہرہ چلے گئے اور کورس سے واپسی پر ان کی پوسٹنگ ایک دوسری یونٹ میں کوئٹہ ہی میں ہوگی۔ اس پوسٹنگ کے باوجود ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہم ایک ہی یونٹ میں ہیں یا الگ الگ۔ ایک دن وہ میرے کمرے میں بیٹھے تھے کہ ان کی نظر میری انگوٹھی پر پڑی وہ اسے بار بار دیکھتے تھے اور مجھے یوں لگا جیسے لوہے کی بنی یہ معمولی انگوٹھی انہیں پسند ہو۔ میں نے انگوٹھی انہیں تحفے میں دیدی۔ جسے وہ کبھی کبھی پہنتے تھے اور بعد میں وہ اسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے جہاں یہ انگوٹھی کئی کھوگئی۔ کیپٹن جاوید کو تاریخی، جنگی اور سیاسی واقعات پر مبنی فلمیں پسند تھیں۔ انہوں نے اپنے کمرے میں ایک وی سی ڈی رکھا ہوا تھا اور جب بھی وہ کسی موضوع پر فلم لاتے ہم سب کو بلا کر دکھاتے تھے اور جہاں سمجھ نہ آتی ترجمہ کر دیتے۔ چلتن مارکیٹ کے قریب ایک وڈیو شاپ تھی جس کے مالک کو کیپٹن جاوید کی چوائس کا پتہ تھا اس لئے وہ ان کے پسندیدہ موضوعات کی فلمیں دستیاب رکھتا۔ اس وقت تک ان کا ایک ہی بیٹا جنید تھا جس کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کی باتوں کو وہ اکثر یاد کرتے اور ہمیں بتاتے کہ جنید کو ان سے کتنا پیار ہے۔ حقیقت میں وہ جنید سے ہی پیار کرتے تھے اور جب انہیں جنید یاد آتا تو وہ اس کے متعلق باتیں کرتے تھے کیپٹن جاوید اقبال سے میری آخری ملاقات ۲۱ جون ۱۹۹۹ء کو ہوئی جب میں پندرہ روز رخصت پر گھر جا رہا تھا اور کیپٹن جاوید کارگل جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ جب میں چھٹی سے واپس آؤنگا تو وہ کوئٹہ سے جا چکے ہوں گے۔ میں آخری بار انہیں ملنے ان کے کمرے میں گیا تو وہ ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے ملے اور مجھے گلے لگایا۔ جب میں کمرے سے

ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے کے لئے نکلا تو کیپٹن جاوید نے ایک بار پھر مجھے گلے لگایا اور اونچی آواز سے کہا شاہ جی خدا حافظ۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب شاید ملیں یا نہ ملیں۔ یہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں اور جب کیپٹن جاوید کا خیال آتا ہے۔ یہ الفاظ خود بخود ذہن پر آجاتے ہیں۔ جیسے ابھی ابھی انہوں نے کہا ہو شاہ جی خدا حافظ یہ آخری ملاقات ہے۔ میں چھٹی سے واپس آیا تو بغیر کسی وجہ کے کیپٹن جاوید اقبال کے کمرے میں چلا گیا حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ وہ جا چکے ہیں مگر ان کی یادیں اس کمرے سے وابستہ تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو کمرہ خالی تھا میں دیر تک اس خالی کمرے کے درودیوار دیکھتا رہا جہاں کچھ روز پہلے زندگی کی توانائیوں سے بھرپور ایک ہنستا مسکراتا شخص رہتا تھا۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید کے الفاظ سچ ثابت ہوئے۔ یہ واقعی آخری ملاقات تھی۔ ہماری اگلی ملاقات ان کے گاؤں دبلہاہ راجگان (کالا ڈب) آزاد کشمیر میں ہوئی۔ جہاں ہم سب اپنی یونٹ کے اس مایہ ناز سپوت کی تدفین کے لئے ان کے گاؤں میں جمع ہوئے۔ کیپٹن جاوید اقبال ۵ اگست ۱۹۹۹ء کو دن کے سوا تین بجے کارگل کے بٹالک سیکٹر میں اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی کے دوران شہید ہوئے اور ۸ اگست ۱۹۹۹ء دن کے سوتین بجے ہیون آف دی ہیونز کے افسروں اور جوانوں نے اپنے اس ہیرو کو سپردخاک کیا اور سلامی پیش کی۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید کے ساتھ چار سالہ رفاقت سنہری یادوں کا نہ بھولنے والا گلدستہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اس شہید کا مقام بدر، اُحد اور کربلا کے شہدأ کے طفیل بلند کرے اور جنت میں بھی یہ دوستی ہمارا مقدر ہو۔ (امین)

کیپٹن سیّد کاشف منیر حسین

ہیون آف دی ہیونز

کوئٹہ ۵ مئی ۲۰۰۱ء

زندہ جاوید

کیپٹن جاوید اقبال شہید ہیون آف دی ہیونز کے وہ مایہ ناز سپوت تھے جن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا انہوں نے کھیلوں اور تربیتی مقابلوں میں یونٹ کا نام روشن کیا اور ہمیشہ وکٹری سٹینڈ پر رہے۔ان کے شہید ہونے سے ملک اور بالخصوص پاکستان آرٹلری ایک بہادر دلیر اور لائق فوجی افسر سے محروم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں کہ شہید زندہ ہوتے ہیں جس طرح اللہ کے ہاں وہ زندہ ہیں اسی طرح ہمارے دلوں میں بھی وہ ہمیشہ زندہ ہی رہیں گے۔کیپٹن جاوید ایک نیک سیرت ہمدرد اور کمزور سے پیار وشفقت کرنے والے انسان تھے۔اتنی خوبیوں والے شخص کا ٹھکانہ یہ دنیا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت جیسے عظیم رتبے سے نواز کر اپنے پاس بلا لیا۔کیپٹن جاوید کی خوبیوں کا ہر وہ شخص معترف ہے جو کبھی کسی بھی جگہ ان سے ایک ہی بار ملا ہے۔اے کاش! اس فوج اور قوم کو ایسے ہی نوجوان قائد نصیب ہوں جن کا مشن جہاد اور منزل شہادت ہو۔

نائیک شوکت علی کوئٹہ
۱۸مئی ۲۰۰۱ء

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا کے حسن اپنی عبادت اور حضرت محمدﷺ کے طریقے پر چلنے کے لئے پیدا کیا۔انسانی زندگی کے اس طویل سفر میں بعض اوقات ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جو اپنی انفرادیت اور انوکھے پن کی وجہ سے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔انسان زندگی میں مختلف حالات سے گزرتا ہے اور اسے اس دنیا میں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے مگر کچھ لوگ یا کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان کے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور پھر انسان ان کی محبت چاہت عقیدت واحترام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔میری فوجی زندگی کے ابتدائی ایام میں مجھے بھی ایک ایسا شخص ملا جس کی خدمت عقیدت ومحبت میں بدل گئی۔وہ شخص ایک نیک سیرت اور سچا انسان تھا۔جس سے میری ملاقات ۱۳فروری۱۹۹۴ء بروز اتوار دن کے تقریباً گیارہ بجے ہوئی۔اس شخص نے مجھ سے پوچھا آپ کا کیا نام ہے اور آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔اس ابتدائی تعارف کے بعد اس نے کہا کہ آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔اس وقت میں یونٹ میں نیا نیا ریکروٹ آیا تھا۔میں نے جواب دیا کہ میں کچھ نہیں جانتا اس لئے میں آپ کے پاس نہیں آنا چاہتا۔مگر کچھ ہی دیر بعد اس کی میٹھی زبان نے میرے دل میں گھر کر لیا۔اس نے کہا کہ مجھے کام نہیں نیک آدمی کی ضرورت ہے۔میں اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتا ہوں۔پھر انہوں نے بٹالین حوالدار میجر کو بلا کر کہا سپاہی نصیر میرے ساتھ کام کرے گا۔اسے میرے ساتھ بھجوا دو۔اسی دن شامی روڈ لاہور میں واقع آفیسرز میس ڈی میں مجھے سیکنڈ لیفٹیننٹ راجہ جاوید اقبال کے ساتھ بطور اردلی بھجوا دیا گیا۔اس سے قبل میں نے کسی افسر کے ساتھ کام نہیں کیا تھا۔اس لئے میں پریشان تھا۔میں جب آفیسرز میس پہنچا تو عصر کا وقت ہو چکا تھا اور ڈی میس کی دوسری منزل پر جاوید صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے اور ساتھ ٹیپ پر انگلش گانا بھی بج رہا تھا۔جب میں نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید اقبال صاحب نے کتاب اور ٹیپ کو بند کیا اور مجھے پاس بلا کر کہا کہ آپ میرے بھائی ہیں اور یہاں پر میرا کوئی کام نہیں ہے۔آپ کا کام مجھے صبح جگانا ہوگا کیونکہ میں رات کو دیر سے سونے کا عادی ہوں۔بعد میں پتہ چلا کہ وہ رات گئے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔یہ میری جاوید صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔اس کے بعد

انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ چائے پلائی اور کہا کہ شاید کل سے رمضان شروع ہو جائے۔ اب آپ عصر کی نماز پڑھیں اور آرام کریں۔ اگر رات کو نماز تراویح پڑھی گئی۔ تو آپ میرے پاس آنا اور دونوں اکٹھے مسجد چلیں گے۔ وہ نماز روزے اور نماز تراویح کے بڑے پابند تھے۔ اگر کبھی رمضان میں ان کو سحری نہیں بھی ملی تو پھر بھی وہ پانی پی کر روزہ رکھ لیتے تھے۔

لاہور میں یونٹ کی طرف سے انہوں نے ہر کھیل میں حصہ لیا وہ ہاکی فٹ بال اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ انہوں نے چارکور کی طرف سے فٹ بال ٹیم میں بھی حصہ لیا۔ آرمی فٹ بال کے میچ ملتان میں کھیلے گئے تو میں ان کے ساتھ ملتان گیا وہی پر انہوں نے لیفٹیننٹ سے کیپٹن کے عہدے کے لئے پروموشن کا امتحان بھی دیا۔ فارغ وقت میں وہ مجھے لے کر ملتان میں واقع تاریخی مقامات اور بزرگان دین کے مزارات دیکھتے اور پھر اپنی نوٹ بک پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ وہ اکثر اپنی بڑی بہن جن سے انہیں بے حد پیار تھا کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی خریدتے۔ ان دنوں ملتان میں شدید گرمی تھی اور رات کو پنکھے کے نیچے سونا بھی مشکل تھا۔ ان کے کمرے میں اے سی لگا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا نصیر میں صبح جب کھیلنے چلا جاتا ہوں تو آپ اسے آن کر کے سو جایا کریں۔ گرمی اور مچھر کی وجہ سے بیرکوں میں پنکھے کے نیچے آپ کو نیند نہیں آتی ہوگی۔ میں نے عرض کی کہ جناب جب نیند آتی ہے تو گرمی سردی کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

جاوید صاحب جب کیپٹن بنے تو ان کو یونٹ ایڈ جوٹنٹ کی ڈیوٹی دی گئی۔ وہ رحم دل انسان تھے مگر جو آدمی جھوٹ بولتا اور غلط بیانی کرتا اس کے ساتھ غصے سے پیش آیا کرتے تھے۔ اگر کسی کے ساتھ ان سے کوئی زیادتی ہو جاتی تو غصہ ٹھنڈا ہونے پر اس آدمی سے معذرت کر لیا کرتے تھے۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید بچوں، بوڑھوں اور معذوروں سے پیار کرتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے کزن راجہ ذوالقرنین صاحب کو لاہور اسٹیشن پر چھوڑنے گئے واپس آ رہے تھے کہ دوبئ چوک کے قریب صدر گلی سے اچانک ایک ضعیف آدمی روڈ پر آ گیا۔ کیپٹن صاحب موٹر سائیکل چلایا کرتے تھے۔ جب موٹر سائیکل اس ضعیف شخص کے بالکل قریب آیا اور کیپٹن صاحب کے کنٹرول کرنے کے باوجود قابو سے باہر ہو گیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ضعیف شخص موٹر سائیکل کی زد سے نہیں بچ سکے گا۔ اس سے پہلے کہ موٹر سائیکل بوڑھے پر چڑھ دوڑتا۔ کیپٹن صاحب نے فوراً موٹر سائیکل الٹا دی اور خود قلابازیاں کھاتے ہوئے موٹر سائیکل سے

کافی دور جا گرے۔اس طرح جاوید صاحب نے ضعیف آدمی کو اپنی جان پر کھیل کر بچالیا اور اس حادثے میں انہیں بڑی شدید چوٹیں آئیں۔ جو زیادہ تر کہنیوں اور گھٹنوں پر تھیں۔میس میں آکر یہ واقعہ مجھے سنایا۔تو میں نے کہا کہ سر آپ کو کچھ ہو جاتا تو انہوں نے جواب دیا نصیر مجھے بزرگوں سے زیادہ محبت ہے۔میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ باباجی میری موٹر سائیکل سے ٹکراتے اور انہیں کوئی تکلیف ہوتی انہوں نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ پر پورا پورا یقین ہے۔ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے اور اس وقت تک موت خود انسان کی حفاظت کرتی۔زندگی کی حفاظت ضروری ہے۔مگر دوسروں کا خیال بھی فرض ہے۔کیپٹن جاوید شہید اپنی جیب میں درود شریف ضرور رکھا کرتے تھے۔ جب وہ سفر میں ہوتے یا پھر کبھی کمرے میں فارغ ہوتے تو درود شریف کا ورد کرتے رہتے۔انہوں نے اپنے کمرے میں ایک فریم میں آیت الکرسی لگا رکھی تھی۔ جب وہ صبح وردی پہن کر آفس جانے کے لئے تیار ہو جاتے۔تو آیت الکرسی کو اس کے سامنے کھڑے ہو کر سلوٹ کرتے اور اپنی آنکھوں کے ساتھ لگاتے اور اس کو چوم کر دفتر چلے جاتے۔ کیپٹن جاوید شہید نے کبھی کسی کے ساتھ فضول بات نہیں کی اور نہ ہی کبھی فون پر بیٹھے ہوئے دیکھے گئے۔ ہاں جب کبھی انگلینڈ سے فون آنا ہوتا یا ان کی بہن کا فون آتا اس کو سننے ضرور جاتے۔ان کی بہن دن میں ایک دو بار ان کا ضرور پتہ کرتیں۔اگر کبھی فارغ نہ ہوتے تو میری ڈیوٹی لگاتے کہ نصیر آپا کا فون آئے گا تم سن لینا۔کیپٹن صاحب کو اردو لکھنی پڑھنی نہیں آتی تھی۔ایک دفعہ گھر سے ان کی بیگم نے انہیں اردو میں خط لکھا تو وہ خط میں نے انہیں پڑھ کر سنایا۔اس کے بعد کبھی ان کی طرف بیگم کا خط نہیں آیا۔انہیں صرف ان کے بھانجے شہریار کے خط آتے جو انگریزی میں ہوتے۔انفنٹری سکول کوئٹہ کورس پر آئے تو یہاں پر انفنٹری سکول کی مسجد کے خطیب سیّد عابد حسین شاہ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن ان خطیب صاحب کی پر جوش اور سریلی آواز میں تقریر ان کو پسند تھی۔ وہ جمعتہ المبارک کو تقریر سننے کے لئے جلدی مسجد چلے جاتے اور خطیب صاحب کی تقریر بڑے دھیان سے سنتے۔ایک دفعہ خطیب صاحب نے حضرت عثمان غنیؓ کے حالات زندگی پر تقریر کی تو انہوں نے واپس آکر مجھے کہا نصیر دیکھوں ہم دنیا کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ حضرت عثمان غنیؓ کے نقش قدم پر ہم کو بھی چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّد عابد حسین شاہ صاحب آج کل نوشہرہ آرڈیننس ڈپو کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام

دے رہے ہیں ایک دن میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کیپٹن کو بتایا کہ کوئٹہ والے خطیب تو اب نوشہرہ آ گئے ہیں یہ سن کر وہ بہت ہی خوش ہوئے اور کہا کہ انشاءاللہ ان کے پیچھے نماز جمعہ پڑھا کریں گے مگر بدقسمتی سے وقت نہ ملنے کی وجہ سے ان کے پیچھے جمعہ کی نماز نہ پڑھ سکے۔ ان خطیب صاحب کے پیچھے جمعہ پڑھنے کی حسرت ان کے دل میں ہی رہی اپنی اس چاہت کو پورا کرنے کے لئے وہ جمعہ کے دن مجھے وہاں بھیج دیتے اور جو تقریر خطیب صاحب کرتے واپسی پر میں انہیں سناتا۔

کیپٹن جاوید شہید دوسروں کی مدد کرنا اپنا فرض عین سمجھا کرتے تھے جب وہ اوایم ٹی کورس کرنے نوشہرہ گئے تو ایک کیپٹن صاحب کے پیسے گم ہو گئے ان کے پاس خرچ کے لئے بھی کچھ نہ بچا۔ جب جاوید صاحب کو پتہ چلا تو بغیر مانگے انہیں دو ہزار روپے دیئے جاوید صاحب کی شہادت کے بعد کیپٹن صاحب نے وہ رقم مجھے بھیج دی تاکہ ان کے گھر بھجوادوں۔ لاہور سے ہماری یونٹ کوئٹہ آئی اور پھر کوئٹہ سے ہم پنج گور مردم شماری کے لئے چلے گئے۔ جاوید صاحب ہیڈ کوارٹر بیٹری کے ساتھ کیچک گئے جہاں ہر دوسرے دن جوانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے اور جوانوں کو خوش رکھنے کے لئے انہیں تاریخی واقعات سنایا کرتے تھے پنج گور جانے سے پہلے وہ ۱۹۹۸ء میں مسرور بیس کراچی کورس پر چلے گئے۔ کلاس سے فارغ ہو کر وہ کراچی کی سیر کرتے اور بطور ترجمان مجھے بھی ساتھ رکھتے۔ وہ روانی سے اپنی مادری زبان پہاڑی اور انگریزی ہی بول سکتے تھے اردو بولنے میں انہیں دقت ہوتی۔ ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر لے گئے اور بڑی دیر تک وہاں مراقبے کی حالت میں رہے۔ کیپٹن صاحب کی ان باتوں سے کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ تو عمر سجیلا جوان انگلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں پڑھا اور پلا ہے۔ یہ پشتوں سے امیر گھرانے کا چشم و چراغ ہے اور اسے کبھی کوئی دکھ یا پریشانی نہیں ہوئی۔ ایسے شخص کا دیندار رحمدل اور پاکباز ہونا اس کی عظمت کی دلیل تھی اور شہادت کا رتبہ حاصل کرنا اس کا حق تھا۔ جب ہم کراچی سے کوئٹہ کے لئے روانہ ہوئے تو دونوں ایک ہی گاڑی میں سوار تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ راستے میں لسبیلہ آ کر ایک ہوٹل پر رکے وہاں ہم دونوں نے چائے پی اور ساتھ بسکٹ بھی کھائے وہ بسکٹ بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ مجھے انہوں نے بسکٹ کھانے کو کہا مگر میں نے کہا کہ نہیں میں بسکٹ نہیں کھاتا۔ تھوڑی دیر گاڑی رکنے کے بعد وہاں سے چل پڑی اور تقریباً ایک یا دو کلومیٹر چلنے کے بعد گاڑی خراب ہو گئی۔ میں گاڑی چلتے ہی سو گیا اور پوری

رات خراب گاڑی میں سویا رہا۔ میری سیٹ پیچھے کی طرف کھل جاتی تھی اور جاوید صاحب کی سیٹ نہیں کھلتی تھی انہوں نے پوری رات بیٹھے بیٹھے گزاری اور صبح چار بجے جب سحری کا وقت ہوا تو انہوں نے مجھے جگایا اور کہا سحری کرلو میں نے کہا کے سرخضدار آ گیا ہے انہوں نے جواب دیا ابھی تک گاڑی وہاں ہی کھڑی ہے جہاں شام کو ہم لوگوں نے چائے پی تھی۔ اب یہاں پر ہوٹل بھی نہیں انہوں نے دو بسکٹ کھانے کے بعد باقی سارے بسکٹ مجھے کھلا دیئے جب میں کھا چکا تو مجھے مذاق سے کہنے لگے نصیر آپ تو بسکٹ نہیں کھایا کرتے تھے۔ پھر بولے اگر آپ بُرا نہیں منائیں تو آپ میرے والی سیٹ پر آ جائیں بیٹھ بیٹھ کر میری کمر درد کرنے لگی ہے میں بھی تھوڑا آرام کولوں۔ اس طرح گاڑی صبح تک ٹھیک نہ ہوسکی اور جاوید صاحب وہاں سے آئل ٹینکر پر بیٹھ کر خضدار آئے۔ وہاں پر ان کے بہنوئی کرنل محمد ایوب صاحب کی یونٹ تھی لیکن کرنل صاحب ابھی تک خضدار نہیں پہنچے تھے۔ وہ خضدار میں کچھ دیر میجر قاضی فاروق صاحب کے ساتھ رہے جن کا تعلق آپ کے گاؤں سے تھا اور پھر وہاں سے بذریعہ بس کوئٹہ پہنچے۔ جب وہ آفیسر میس پہنچے تو آذان ہو چکی تھی۔ اس دن انہوں نے صرف پانی پی کر روزہ رکھا۔ جاوید صاحب شب برات، شعبان اور شوال کے روزے بھی رکھا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری سال میں وہ شب برات کا روزہ نہ رکھ سکے ان دنوں وہ بارہ کور اتھیلیٹک ٹیم کے ساتھ بہاولپور گئے ہوئے تھے اور میں چھٹی پر گیا تھا۔ جب میں واپس آیا تو انہوں نے افسوس کیا اور کہا کہ نصیر اس دفعہ آپ نہیں تھے تو مجھے شب برات کا پتہ نہیں چلا جس کی وجہ سے میں روزہ نہیں رکھ سکا۔ چند روز پہلے میری بیگم نے انگلینڈ سے فون کیا اور پوچھا کہ شب قدر کیسے گزری تو میں نے کہا کہ مجھے تو پتہ نہیں کہ شب قدر کب گزری ہے۔

آخری بار کیپٹن صاحب اپنے والدین بیگم اور بچوں سے ملنے انگلینڈ گئے وہ اپنے بچوں بہن بھائیوں اور والدین کو بہت یاد کرتے تھے۔ اس بار انہیں چھٹی بڑی مشکل سے ملی تھی حالانکہ پہلے کبھی ایسے نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے بیٹے حمزہ کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے جن کی پیدائش ابھی انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ وہ اکثر کہتے اس بار امی ابو بہت یاد آ رہے ہیں جاوید صاحب اکثر پریشان ہو جاتے چونکہ انہیں منافقت جھوٹ اور چالبازی سے شدید نفرت تھی۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ان کی نظر سے گزرتا تو کہتے اس دفعہ ڈیڈی سے پوچھ کر آؤں گا اور استعفیٰ دے کر واپس چلا جاؤں گا۔ ان کی یہ بات سن کر میں کہتا سر میرا کیا بنے گا تو کہتے تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ پھر کہتے میں واپس چلا گیا تو آپا پھر اکیلی رہ جائیگی اور اب

میرے والدین کی خوشی بھی اسی میں ہے کہ میں فوج میں ہی رہوں۔ میں ان کی خوشی کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں مجھے ہمت نہیں پڑتی کہ ان سے فوج چھوڑنے کا پوچھوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرے والدین میری اس بات پر مجھ سے ناراض ہو جائیں میں تو صرف اپنے والدین کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں انگلینڈ سے واپسی پر وہ میرے لئے ایک گھڑی لے کر آئے کہنے لگے نصیر اس طرح کی گھڑی اس لئے لائی ہے کہ آپ نماز پڑھتے ہیں وضو کرتے وقت آسانی سے اتر جاتی ہے اس کا چین کھینچنے سے کھل جاتا تھا انہوں نے ڈیک اور ٹی وی خریدا تو مجھے کہنے لگے نصیر مجھے پتہ ہے یہ چیزیں رکھنا گناہ ہے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے تو میں نے خریدی ہیں وہی معاف بھی کرنے والا ہے۔ وہ اکثر مجھے دعا کرنے کو کہا کرتے تھے ہر نماز کے بعد اور جمعہ کو خصوصی دعا کرنے کو کہتے ان کو دعا پر بڑا یقین تھا۔ وہ اکثر کہتے کہ فوجی افسر دعاؤں ہی کے سہارے چلتا ہے۔ ۱۹۹۵ء کا واقعہ ہے کہ لاہور میں نماز عصر کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میرے منہ سے نکلا یا اللہ جاوید صاحب کو شہادت کی موت دے۔ پھر یہ الفاظ بار بار نکلنے لگے اور میری ہچکی بند گئی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنے والدین اور عزیزوں کی بخشش کی دعا کروں مگر بار بار یہی الفاظ دہراتے ہوئے میں مسجد میں گر گیا۔ اس واقعہ نے کئی روز تک مجھے پریشان رکھا۔ میں جب بھی جاوید صاحب کو دیکھتا تو ایسے لگتا جیسے یہ واقعی شہید ہو کر جنت میں جانے والے ہیں۔

میں اکثر خواب میں انہیں شہداً کی صف میں دیکھنے لگا تو میری پریشانی بڑھ گئی۔ مجھے اداس دیکھ کر کیپٹن صاحب نے مجھے پاس بلایا اور وجہ پوچھی تو میں نے اپنی دعا کا واقعہ سنایا۔ یہ سن کر کہنے لگے نصیر یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے مگر ہماری اتنی اچھی قسمت کہاں شہادت کے لئے اللہ اپنے نیک بندوں کا ہی انتخاب کرتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد نماز عصر کی دعا کا واقعہ پھر پیش آیا اور جو الفاظ لاہور میں میری زبان پر بار بار آتے تھے پھر جاری ہو گئے میں نے کہا کہ سر آج پھر آپ کے لئے بار بار وہی لاہور والی دعا ہوتی ہے۔ سر اب اللہ تعالیٰ آپ کو شہادت کے درجے سے نوازیں گے۔ ان کو اکثر میں شہید کے درجات اور جنت کی نعمتوں کے بارے میں حدیث شریف سنایا بھی کرتا تھا۔ یہ ان کا حکم تھا کہ میں اردو نہیں پڑھ سکتا۔ اس لئے تم مجھے احادیث نبوی ﷺ کا ترجمہ سنایا کرو۔ کیپٹن صاحب کا اردلی ہونا میرے لئے باعث رحمت تھا۔ میرے ذمے جو کام میرے صاحب نے لگا رکھے تھے ان میں ایک شہادت، جہاد اور شہید کے متعلق احادیث سنانا بھی تھا۔ لہٰذا میں ہر روز ایک حدیث انہیں سناتا تھا۔ جب وہ نوشہرہ لوکیٹنگ

کورس پر گئے تو انہوں نے سکول آف آرٹلری کی لائبریری سے اپنے نام پر مجھے ایک کتاب خطبات محمدﷺ لے کر دی۔ اس سے ہر روز میں ان کو حضورﷺ کے پیارے پیارے خطبات پڑھ کر سنایا کرتا۔ وہ صبح صبح ڈیک پر قاری عبیدالرحمان کی آواز میں سورۃ الرحمان سورۃ یٰسین اور سورۃ نور کی تلاوت سنتے تھے جب انہوں نے ایک آیت کریمہ کا ترجمہ سنا کہ جنت میں سبز رنگ کے قالین ہوں گے تو انہوں نے اپنے کمرے میں بھی سبز رنگ کی قالین بچھائی اور کھڑکیوں پر سبز رنگ کے پردے لگا دیئے۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید درود شریف کثرت سے پڑھا کرتے تھے ایک دن میں نے درود مقدس کے فائدے بتائے اور بتایا کہ اگر انسان کو پڑھنے کا موقع نہ ملے تو ایک بار سن بھی لے تو بڑی فضیلت ہے۔ انہوں نے مجھ سے درود مقدس سنا جب عصر کی نماز کے بعد ان کے لئے شہادت کی دعا بار بار میرے منہ سے نکل رہی تھی تو میں نے کہا کہ سر آپ نے شہید ہو جانا ہے آپ کی تقدیر میں یہی لکھا ہے۔ انہیں دنوں آپ کو نوشہرہ کورس پر جانا تھا اور آپ اس کی تیاری میں مصروف تھے کہ اچانک آپ کا نام کارگل جانے کے لئے آ گیا۔ مجھے بلا کر کہا اب نوشہرہ کو چھوڑو میں محاذ جنگ پر جا رہا ہوں زندگی رہی تو واپس آ کر کورس پر جاؤں گا کسے پتہ تھا کہ غلامان جنت ان کے منتظر ہیں۔ میں نے بے خودی سے روتے ہوئے کہا سر اب آپ کا وقت نزدیک آ چکا ہے آپ جلدی ہی مجھ سے جدا ہونے والے ہیں۔ یہ سن کر وہ بولے نصیر تم دعا کرتے رہنا۔ میرے متعلق جی ایس او تھری کیپٹن انوار تارڑ کو بتایا کہ میں واپس نہیں آؤں گا میں نے انشاءَ اللہ تعالیٰ شہید ہو جانا ہے۔ کیپٹن تارڑ جذباتی ہو کر بولے اور اونچی آواز میں کہا جاوید چپ کرو تمہیں کون یہ خبریں دیتا ہے۔ تم واپس آؤ گے تم شہید نہیں ہو سکتے انہوں نے کہا کہ مجھے نصیر کی دعا پر پورا پورا یقین ہے۔ نصیر جھوٹ نہیں بول سکتا انشاءَ اللہ مجھے شہادت ضرور ملے گی۔ ۲۴ جون ۱۹۹۹ء کو ہم ڈیک پیک کر رہے تھے کہ ہم دونوں سے وہ اچھی طرح پیک نہیں ہو رہا تھا اس کو پیک کرتے کرتے رات کے تین بج گئے شاید ڈیک کے بہانے اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو گپ شپ کا موقع دیا تھا میں نے پوچھا سر لوگ تو کہتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو شہادت کی موت عطا کرے لیکن دل میں خواہش ہوتی ہے کے انسان کو اس دنیا میں بہت سی دولت اور آرام دے بعد میں دیکھی جائے گی۔ انہوں نے کہا نصیر بھائی ایک تم ہی ہو جس کو میں دل کے حالات سے آگاہ کرتا ہوں میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جاوید صاحب سچ بولنے اور عہد پورا کرنے والے انسان تھے ان کا ایمان پہلے ہی پختہ تھا مجھ سے حدیث

نبوی ﷺ سن سن کر ان کا ایمان اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں کافی حدیثیں سنائیں مگر چار حدیثیں انہیں پسند آئیں جو کے ان کے دل میں اتر گئی تھیں۔

(۱) جس نے عہد پورا نہیں کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

(۲) سچ بولنا مسلمان کی صفت میں شامل ہے۔

(۳) مسلمان ہر کام کر سکتا ہے مگر جھوٹ بولنا اس کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) شہید بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو گا اور شہید کے خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اس کی روح کو جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

کیپٹن جاوید شہید اکثر کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سب کچھ دیا۔ اب اگر شہادت کی موت بھی دے تو اور کیا چاہئے۔ پھر کہتے میری اتنی تیاری نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کو حساب دے سکوں میں چاہتا ہوں بغیر حساب کے جنت مل جائے شاید وہ تین بجے والی گھڑی کیپٹن صاحب کے لئے قبولیت کی گھڑی تھی۔ ۲۵ جون ۱۹۹۹ء کو جاوید صاحب گھر جانے لگے تو مجھے کہا نصیر میری شہادت کے بعد میرا سامان میرے گھر پہنچا دینا میں نے کہا سر میری بھی یہی خواہش ہے اگر پہلے میں اس دنیا سے چلا گیا تو انہوں نے جواب دیا میرے اور اپنے سامان پر چٹ لگا دینا تا کہ یونٹ والے چٹ پڑھ کر ہمارا سامان گھر بھیج دیں۔ میں نے کہا کہ سر آپ سے پہلے میں دنیا سے چلا گیا تو آپ ہر نماز کے بعد ایک دفعہ سورۃ فاتحہ اور تین بار سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب مجھے بخش دینا وہ ہنس کر کہنے لگے مجھ سے نمازوں میں اکثر کوتاہی ہو جاتی ہے لیکن آپ کے لئے ہر روز بغیر نماز کے ہی پڑھ لیا کروں گا لیکن آپ میرے ساتھ وعدہ کریں آپ کو میرے لئے ہر نماز کے بعد یہی پڑھنا ہو گا اور اللہ تعالیٰ سے میری بخشش طلب کرنا ہو گی۔ میں نے کہا سر سنا ہے شہید اپنے رشتہ داروں کی شفاعت کا ذریعہ بنتا ہے۔ آپ نے روز قیامت میری شفاعت کرنی ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شہادت نصیب کی تو ضرور آپ کی سفارش کروں گا۔ میں نے ہنس کر کہا جناب آپ بھول جائیں گے تو کہنے لگے ایسے نہیں ہو سکتا تم میری خدمت کرتے رہے ہو اب تم میرے ہی خاندان کا حصہ ہو۔ وہ دنیا اور ہے وہاں بھول جانا آسان نہیں۔ وعدہ رہا پہلے تمہاری سفارش کروں گا ہاں وعدہ کرو اگر تم شہید ہو گئے تو پھر مجھے جنت میں لے جانا۔

کیپٹن صاحب جب گھر جا رہے تھے تو کمرے کے باہر برآمدے میں کیپٹن انعام اللہ قمر

کھڑے تھے ان کو جاوید صاحب نے کہا کہ میں جا رہا ہوں نصیر کا خیال رکھنا یہ میری امانت ہے آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں کچھ عرصہ تک کیپٹن صاحب نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور جاوید صاحب کی شہادت کے بعد میرا ویسے ہی خیال رکھا پھر میری شادی ہوگئی تو میں ان کی خدمت نہ کر سکا۔ ۲ جولائی ۱۹۹۹ء کو کیپٹن جاوید شہید نے مجھے اپنے گھر دعوت پر بلایا میں دن کے تقریباً ایک یا ڈیڑھ بجے کالا ڈب آزاد کشمیر پہنچا کیپٹن صاحب میرے انتظار میں کھڑے تھے جب میں ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا نصیر دیکھوں مجھے سخت بھوک لگی ہے پہلے کھانا کھاتے ہیں بعد میں گپ شپ ہوگی۔ اپنے بھانجوں عمار اور شہر یار کو بھی انہوں نے کھانا نہیں کھانے دیا تھا اور انہیں بھی میری وجہ سے انتظار کروایا۔ ان کو بھی بڑی سخت بھوک لگی ہوئی تھی ہم چاروں نے اکٹھے کھانا کھایا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اپنی بہن کے گھر لے گئے اس دن انہوں نے مجھے اپنے والد کی زمینیں اور مکانات دکھائے اور کہنے لگے اگر زندہ واپس آیا تو سب سے پہلے کھلی جگہ پر مکان بنواؤں گا۔ میں نے ابو سے اس سلسلے میں بات کر لی ہے یہ جگہ وہی ہے جس کے قریب اب اس شہید کا مزار ہے۔ کہنے لگے کے یہ جگہ مجھے پسند ہے پھر کہنے لگے کہ گھر کے باہر بڑا گیرج بنواؤں گا پہلا گیرج چھوٹا تھا اس لے اسے ہٹا دیا ہے اس میں صرف بھائی (کرنل ایوب) کی گاڑی کھڑی ہوتی تھی اب ان کے آنے سے پہلے بڑا گیرج بن جائے گا تا کہ دو گاڑیاں کھڑی ہو سکیں۔ جنید کہتا ہے کہ میرے لئے بھی کار خرید و۔ انشاءَ اللہ واپسی پر نئی کار خریدیں گے۔ ان کے دل میں بے شمار منصوبے تھے جو دل میں ہی رہ گئے اور وہ اگلی دنیا کو سدھار گئے۔ کچھ دیر ان کے ساتھ گاؤں میں گزار کر میں نے اجازت چاہی اور عرض کی کہ سر اب گھر جا تا ہوں کہنے لگے تمہاری مرضی میں تو چاہتا ہوں تم رات بھی یہاں گزارو صبح چلے جانا بحر حال تمہیں گھر بھی جانا ہے اس لئے مجبور نہیں کرتا۔ میری ان کے ساتھ یہ آخری ملاقات تھی۔ جب میں ان کے گھر سے نکلا تو وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رخصت کر رہے تھے جب میں ان کی نظروں سے گم ہونے والا تھا تو انہوں نے مجھے آواز دی نصیر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر کئے اور کہا اللہ حافظ۔ وہ منظر مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ منظر ہر وقت میرے ذہن میں گھومتا رہتا ہے اور بہت ہی ستاتا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جس وقت میرے محسن نے مجھے آخری بار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہا۔ ۸ جولائی ۱۹۹۹ء کی شام انہوں نے یونٹ میں فون کیا جو نائیک کلرک سلطان نے سنا۔ جاوید صاحب نے کہا کے

نصیر سے میری بات کراؤ۔ مجھے کہنے لگے میں واپسی پر تمہارے لئے کیا گفٹ لاؤں میں نے کہا کہ سر آپ واپس آئے تو کچھ لائیں گے اس وقت ہماری باتیں سپاہی ارشد بھی سن رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ شاید واپس آ ہی جاؤں پھر بولے وہاں سے کیا لا سکتا ہوں وہاں تو صرف برف ہی ہے۔ یہ فون پر ان کے آخری الفاظ تھے کے میرے لئے دعا کرنا اس فون سے پہلے ۵ جولائی ۱۹۹۹ء کو میں نے ان کے گھر فون کیا کہ میری چھٹی کینسل ہوگئی ہے اور مجھے یونٹ میں واپس بلایا گیا ہے۔ جاوید صاحب کی بیگم نے بعد میں بتایا کہ جب تمہارا فون آیا تو اس وقت کیپٹن صاحب ناشتہ کر رہے تھے فون سننے کے بعد انہوں نے ناشتہ نہیں کیا بلکہ پریشان ہوگئے اور کہنے لگے کہ نصیر کو یونٹ والوں نے بلا لیا ہے پتہ نہیں کیا بات ہے وہ میرا خیال اپنے بھائیوں کی طرح رکھتے تھے۔ جاوید صاحب کو سادگی پسند تھی میں نے ایک دن پوچھا سر آپ کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے انہوں نے کہا کے میں ہر چیز شوق سے کھاتا ہوں کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے می   اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کو برا نہیں کہہ سکتا۔ جاوید صاحب کی سادگی بے ساختگی ذہانت بہادری دلیری اور عقل وفہم کے متعلق کیا کہوں۔ ہر یاد پر آنکھیں نم ہوتی ہیں اور دل میں درد اٹھتا ہے۔ میں نے پانچ سال چار ماہ اور تیرہ دن ان کے ساتھ گزارے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو۔ وہ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد کے باہر کھڑے غریب لوگوں کو پیسے دیا کرتے تھے جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہوتے تو دعا مانگنے کے بعد مجھے کہتے دیکھو کتنا کھانا بچ گیا ہے کچھ ایسے غریب بھی ہوں گے جن کو کھانا نہیں ملا ہوگا اور پھر کہتے ہم کتنے ناشکرے ہیں مگر اللہ تعالیٰ پھر بھی ہم جیسوں پر کرم کرتا ہے۔

جاوید صاحب ۲۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کو انگلینڈ کے شہر لوٹن میں پیدا ہوئے وہ سچے عاشق رسول ﷺ اور نیک انسان تھے۔ سادگی دیانت داری ماں باپ کی اطاعت بہن کی محبت اللہ کی عبادت اور شہادت کی چاہت میں اپنی زندگی کے ۲۷ سال ۳ ماہ اور تیرہ دن گزارنے کے بعد بٹالک کے سیاری سیکٹر میں ۵ اگست دن کے سوا تین بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید وہ خوش قسمت انسان تھے جن کی اللہ تعالیٰ نے ہر خواہش پوری کی شہادت کی خواہش شاید ہی کسی خوش نصیب کی پوری ہو کیونکہ شہادت کا رتبہ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو عطا نہیں کرتے۔ کیپٹن جاوید اقبال اکثر مجھے خواب میں ملتے ہیں اور یوں لگتا ہے وہ اب بھی میرے ساتھ ہیں ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جاوید صاحب ایک بازار

میں کھڑے ہیں۔اس بازار میں ساری کی ساری دوکانیں تازہ پھولوں اور ہاروں سے بھری پڑی ہیں۔ وہاں سے انہوں نے ایک ہار خریدا تو ان کی بیگم نے کہا آپ اس ہار کا کیا کریں گے انہوں نے کہا کہ نصیر کی شادی ہے اسکے گلے میں ڈالوں گا اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اس خواب کے ایک ماہ بعد ایک ایسا واقعہ ہوا کہ اچانک کوئٹہ میں میری شادی جہاں میں چاہتا تھا ہوگئی۔کیپٹن صاحب کی بیگم کو میری شادی کا پتہ چلا تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا مجھے اور میری بیوی کو تحفے دیئے اور ہمیں اپنے گھر کالا ڈب آزاد کشمیر میں دعوت دی۔ایک دفعہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مسجد نبوی ﷺ سے نماز پڑھ کر نکلا ہوں اور جاوید صاحب کلمہ شہادت پڑھ رہے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ تم نے محفل شبینہ نہیں سنی۔آج میں نے دو پارے سنائے ہیں۔پھر کہا نصیر میں نے قرآن حفظ کرلیا ہے یہ دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی خدا جانے اس خواب کی کیا تعبیر ہے۔جاوید اقبال شہید اپنے بیٹوں جنید جاوید اور حمزہ جاوید کو یاد کیا کرتے تھے۔وہ اپنے والدین بہن بھائیوں اور اپنے کزن ذوالقرنین صاحب بھانجوں انوار شہریار عمار اور ماموں کا ذکر اکثر میرے ساتھ کیا کرتے تھے۔کیپٹن جاوید اقبال کے دوستوں میں میجر شاہد میجر دلاور کیپٹن ناصر کیپٹن سلیم عرف چیتا اور کیپٹن نعیم ہی قریب تھے۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید نے محاذ جنگ پر جانے سے پہلے مجھے چند وصیتیں کی تھیں انہوں نے کہا کہ نصیر میری قبر کچی رکھنا اور میری خواہش ہے جنید حافظ قرآن بنے اور حمزہ آرمی میں کمیشن لے میری شہادت کے بعد تم میرے گاؤں کی مسجد میں آذان پڑھنا میں سنوں گا۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید کی محبتوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کو ہر کوئی اچھے الفاظ سے یاد کرتا ہے میرے گاؤں والوں نے انہیں کبھی دیکھا نہیں مگر اس کے باوجود ان کی شہادت کی خبر جب میرے گاؤں پہنچی تو پورے گاؤں میں اداسی چھا گئی۔میرے گاؤں کی مسجد کے امام محمد یوسف خان صاحب ہر جمعہ کی نماز کے بعد جاوید صاحب کے درجات کی بلندی کی دعا مانگتے ہیں ہماری یونٹ کا دھوبی چچا سرور اکثر کیپٹن صاحب کو یاد کرتا ہے اور ان کی یاد میں غمگین ہو جاتا ہے۔

یونٹ کے نائیک نصیر احمد عباسی اور غلام مرتضٰی ستی ہر نماز کے بعد بلند آواز میں جاوید صاحب کے لئے دعا کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔کون ہے جس نے اس مرد مجاہد کو ایک بار دیکھا ہو اور وہ انہیں بھول جائے۔ہر شخص ان کے درجات کی بلندی ان کے بچوں کی درازی عمر کے لئے دعا گو

ہے۔ ہماری یونٹ کے کرنل امتیاز صاحب نے انگریزی اخبار میں جاوید صاحب کے متعلق مضمون لکھا اور دعا کی کہ اللہ ہمیں اتنی زندگی دے کہ حمزہ جاوید اسی شان سے ہیون آف دی ہیونز میں آئے اور اپنے باپ کی کرسی پر بیٹھے۔ دعا ہے کہ ہر پاکستانی افسر اور جوان کیپٹن جاوید جیسا ہو اور کوئی میلی آنکھ اس ملک کی سرحدوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کرے (آمین)

سپاہی نصیر احمد
ہیون آف دی ہیونز
کوئٹہ ۲۰ مئی ۲۰۰۱ء

۱۴ ااپریل ۱۹۹۴ء کو ۸۹ پی ایم اے لانگ کورس کے نوجوان افسروں نے مادرِ وطن کی حفاظت کی قسم کھائی تو اگلی صفوں میں پریڈ کی قیادت کرنے والے کیڈٹ ہاتھوں میں چمکتی شمشیریں اٹھائے کھڑے تھے جن کے چہروں سے کامیابی اور کامرانی کی ایک جھلک نظر آ رہی تھی یہ شمشیر زن اس کورس کا دل و دماغ تھے جنہوں نے دوسالہ تربیت کے دوران اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور آخری ٹرم میں کمپنی سینئر انڈر آفیسر ز بنکر پاسنگ آؤٹ کے دن سب سے آگے اور نمایاں کھڑے ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

انہیں سینئر انڈر آفیسروں میں کورس کا سب سے نمایاں کیڈٹ اور معصوم آفیسر راجہ جاوید اقبال بھی تھا۔ جاوید جس طرح پی ایم اے میں سب پر سبقت لے جاتا ویسے ہی وہ زندگی کی دوڑ میں بھی سب سے آگے نکل گیا۔ اس نے ۸۹ پی ایم اے لانگ کورس کی قسم کی لاج رکھتے ہوئے سب سے پہلے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور ۵۔ اگست ۱۹۹۹ء کو اپنے خون سے وطن کی سرحد پر سرخ لکیر کھینچ کر ثابت کر دیا کہ وہ واقعی سبقت لے جانے اور پہل کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا۔ جاوید ہمارے کورس کا دل تھا جو ہم نے وطن کی مٹی پر وار کر دیا۔ جاوید زندہ جاوید ہے مگر ہماری آنکھوں میں وہ قوت نہیں کہ ہم اس کے درجات اور مقام کا مشاہدہ کر سکیں جاوید کو میں نے ہمیشہ زندہ دل پُر امید اور ہنستا مسکراتا پایا۔ انگریزی لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے والا یہ ذہین اور سمارٹ نوجوان فٹ بال کا بہترین کھلاڑی اور کراٹے کا بلیک بیلٹ بھی تھا۔ پی ایم اے میں پہلے بابر کمپنی اور بعد میں اورنگزیب کمپنی میں رہتے ہوئے جاوید کا رابطہ اکیڈمی کی اٹھارہ کمپنیوں سے رہتا۔ پی ایم اے کے سخت ماحول میں بھی میں نے اسے کبھی اکتاہٹ محسوس کرتے یا پھر غیر شائستہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ سخت لمحات میں مسکرانے والا اور تکلیف کو ہنسی مذاق میں اڑا دینے والا شخص تھا۔ جاوید کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ پی ایم اے میں مشقوں کے دوران وہ گپ شپ کی لمبی محفلیں جماتا اور کبھی بھی اس کے پاس دلچسپ باتوں اور مزیدار ٹافیوں کا ذخیرہ ختم نہ ہوتا۔ جاوید ذہنی اور جسمانی طور پر مکمل فٹ اور کورس کے صفِ اوّل کے کیڈٹس میں شمار ہوتا تھا۔ جاوید کبھی بھی کام کی ٹینشن نہ لیتا وہ دوستوں میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ ہم پیار سے

اسے جیک کہتے تھے۔

میں نے توپخانے میں رہتے ہوئے اپنا ابتدائی کورس اور جونیئر آفیسرز لیڈرشپ کورس نوشہرہ اور پھر کوئٹہ میں جاوید کے ساتھ ہی کیا۔ جاوید افسر بن کر بہت ہی ذمہ دار اور جذبہ جہاد سے سرشار ہو گیا تھا۔ وہ بے مقصد اور سست زندگی کے خلاف تھا۔ وہ جس طرح پی ایم اے میں صف اوّل میں تھا ویسے ہی عام زندگی میں بھی نمایاں اور سب سے آگے رہا۔ وہ ہر کورس میں اپنا ریکارڈ بہتر بناتا گیا حالانکہ وہ اس کے لئے کبھی بھی راتوں کو نہ جاگتا بلکہ کلاس روم میں بیٹھ کر لیکچر دل و دماغ پر نقش کر لیتا۔ جاوید کی اس خدا داد صلاحیت کی وجہ سے اس کے سینئر اور استاد سبھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ جاوید کم عمری اور کم سروس کے باوجود توپخانے کے اچھے اور ذہین افسروں میں شمار ہوتا تھا وہ اپنے جونیئرز کے لئے ایک رول ماڈل تھا جبکہ اس کے انڈر کمانڈ ہمیشہ اس پر فخر کرتے اور ہر لمحہ اس کے لئے جان قربان کرنے کو تیار رہتے۔

جاوید خوش مزاج خوش لباس اور خوش اخلاق افسر تھا۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جسے کبھی اس نے ناراض کیا ہو۔ وہ دوستوں کی جان اور رجمنٹ کی آن تھا۔ ایسے شخص کے لئے شہادت سے بڑھ کر اور کیا مقام ہو سکتا تھا۔ ۱۹۹۹ء میں جب کارگل کا محاذ کھلا تو ۸۹ پی ایم اے لانگ کورس کے بیشتر آفیسرز مڈ کیریئر کورس کرنے سکول آف آرٹلری نوشہرہ میں موجود تھے جب کہ کورس کے چند جیالے کارگل کی برف پوش چوٹیوں پر وطن کی حفاظت پر مامور دن رات دشمن کے تابڑ توڑ حملوں کا کمال جرأت اور استقلال سے جواب دے کر اس کے بد ارادوں کو خاک میں ملا رہے تھے۔ وطن کے ان محافظوں اور عظیم فرزندوں میں ۸۹ پی ایم اے لانگ کورس کا دل زندہ دل اور سر بکف ہیرو کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید بھی تھا۔ جاوید نے محاذ جنگ پر جانے سے پہلے ہی اپنی شہادت کی پیشن گوئی کی اور سب کو آخری سلام پیش کر کے اپنی منزل کی طرف چلا۔ اس نے میدان جنگ کی صعوبتوں کو بھی ہنس کر ٹال دیا اور اپنی عزت نفس اور عقیدت ایمانی پر آنچ نہ آنے دی۔ وہ جس مقصد کی تکمیل کے لئے انگلینڈ سے پاکستان آیا آخر کار اس میں کامیابی کا سنہری سہرا اپنے سر سجا کر جنت کے حقداروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ جاوید کی یادیں اور باتیں انمٹ نقوش ہیں جنہیں دل ہی دل میں یاد تو کیا جا سکتا ہے مگر بیان مشکل ہے۔ تقریباً دو ماہ قبل پشاور گیریژن مس میں میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی جو جاوید سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔

مجھے خیال آیا شائد یہ جاوید کا چھوٹا بھائی ہو۔ پوچھا تو پتہ چلا نوجوان کا نام شہریار ایوب ہے اور کیپٹن جاوید اقبال شہید کا بھانجا ہے۔ ایک دن شہریار نے بتایا کہ اس کا بڑا بھائی جو انگلینڈ میں زیرِتعلیم ہے ماموں جی کی زندگی پر کچھ لکھ رہا ہے جس میں ماموں جی کے دوستوں کی تحریریں بھی شامل کی جائینگی۔ میں نے جاوید کے متعلق لکھنے کی حامی تو بھر لی مگر لکھنا انتہائی دشوار ہو گیا۔

جب بھی کچھ لکھنے کی ہمت کرتا تو جاوید کا سراپا سامنے آجاتا اور پھر خیال آتا کہ وہ اب ہم میں نہیں۔ میں کچھ لکھنے کے بجائے خیالات کے سمندر میں خود کو ڈوبتا محسوس کرتا کہ قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ آخر ہمت کر کے میں نے ایک ادھوری تحریر جسے میں پشاور سے ترتیب دے رہا تھا آخر کار شہریار کے والد کرنل ایوب کے نام کوئٹہ سے بھجوائی۔ جاوید کے متعلق کیا لکھوں۔ ایسے نوجوان ہی قوم کا اثاثہ ہیں جو زندگی میں سراپا عمل رہتے ہیں اور موت کے بعد پیغام عمل چھوڑ جاتے ہیں تا کہ عزم واستقلال کی زنجیر ٹوٹنے نہ پائے۔

کیپٹن شاہ بخت زمان پشاور

۲۸ مئی ۲۰۰۱ء

زندگی حادثات اور واقعات کا مجموعہ ہے جسے انسان اپنے کردار وعمل سے تلخ وشیریں بناتا شارع زندگی سے گزر جاتا ہے۔ انسان جس جذبے اور شوق سے زندگی گزارتا ہے اسی جذبے اور شوق سے اس کا خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ اگر جذبات میں نیکی اور پاکیزگی کا جوش اور شوق میں شوق شہادت کا عنصر شامل ہو جائے تو انسان کا خاتمہ خیر پر ہوتا ہے۔ ایسا شخص جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات اور واقعات نہ صرف تاریخ کے سنہرے اوراق کا حصہ بن جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی زندگی اور موت آنے والی نسلوں کیلئے شارع زندگی کا دستورعمل بنکر صدیوں تک انسانوں کی رہبری ورہنمائی کا موجب بن جاتی ہے۔

1996ء میں میری پوسٹنگ مظفر آباد آزاد کشمیر کے پانڈو سیکٹر میں تھی جہاں میں عارضی ڈیوٹی پر تھا کہ مجھے واپس اپنی یونٹ میں جانے کا حکم ملا۔ میں یونٹ واپس آیا تو پتہ چلا کہ کم سروس والے وہ سپاہی جو کسی وجہ سے جسمانی معذوری کا شکار ہیں حکومت کی طرف سے حکم آیا ہے کہ انہیں ڈسچارج کر دیا جائے۔ میری یونٹ میں مجھ سمیت جو لوگ کسی معذوری کا شکار تھے اس کی وجہ بیماری یا حادثہ نہیں تھا بلکہ یہ لوگ میدان جنگ کے غازی تھے۔ اُس وقت یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب تھے۔ کرنل صاحب نے بالا کمانڈروں سے بات کر کے معذور افراد کیلئے خاص رعائت حاصل کر لی اور جو لوگ خود جانا نہیں چاہتے تھے انہیں باقی نوکری پوری کرنے کا موقع مل گیا۔ کرنل صاحب کا خیال تھا کہ یہ معذوری میدان جنگ کی ہے اس لئے جن لوگوں نے ملک اور قوم کی حفاظت کی خاطر تکلیف اٹھائی ہے انہیں ساتھ رکھنا دوسروں کیلئے باعث افتخار ہے۔ نوکری میں رہنے کا فیصلہ ہوا تو مجھے کرنل صاحب نے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا چونکہ میرا تعلق ان کے علاقہ سے تھا اس طرح میں نے سروس کے باقی نو سال کرنل صاحب کے ساتھ ہی گزار دیے۔

کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید کا تعلق توپخانے کی یونٹ سے تھا جو اس وقت لاہور میں ہماری ہی فارمیشن کا حصہ تھی۔ کرنل ایوب صاحب کیپٹن صاحب کے بہنوئی اور پھپھی زاد بھی تھے اس لئے ان کا کرنل صاحب کے ہاں اکثر آنا ہوتا تھا۔ کیپٹن جاوید صاحب کرنل صاحب کے بچوں سے بے حد پیار

کرتے تھے۔ لاہور سے ہماری یونٹ خضدار گئی تو کیپٹن صاحب کی پوسٹنگ بھی کوئٹہ ہوگئی۔ میں چونکہ کرنل صاحب کے بیٹوں کے ساتھ جو کہ کوئٹہ میں زیرِ تعلیم تھے رہتا تھا اس لئے کوئٹہ رہتے ہوئے کیپٹن جاوید صاحب سے ایک خاص تعلق پیدا ہوا جوان کی شہادت تک کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید انتہائی ملنسار اور ہر شخص کا دکھ اور درد بانٹنے والے انسان تھے۔ جو بھی ان سے ملتا ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ جاوید صاحب انگلینڈ میں پیدا ہوئے اور وہیں پڑھے اور پلے تھے مگر جس طرح وہ بچوں سے شفقت اور بڑوں کا ادب کرتے کوئی شخص یہ گمان نہیں کرسکتا تھا کہ یہ شخص مغربی معاشرے میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا ہے۔ فوج میں نوجوان افسر عمر میں کئی لوگوں سے چھوٹے ہوتے ہیں اور اکثر اپنے ماتحتوں کو تم کہہ کر پکارتے ہیں چونکہ فوج میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ بڑا وہی ہوتا ہے جس کا عہدہ بڑا ہو اور وہ اپنے عہدے کے لحاظ سے ہی اپنے حکم کی تکمیل کرواتا ہے۔ فوج کے اپنے قانون اور قائدے ہیں اور ان ہی قوانین پر عمل کر کے فوج اپنا ڈسپلن برقرار رکھتی ہے۔ کیپٹن جاوید اقبال شہید کی بیشمار خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر شخص کو اس کے مکمل نام کے ساتھ اور آپ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیپٹن صاحب مجھے چچا محمود کہتے تھے۔ ایک بار میں نے کہا سر آپ افسر ہیں اور میں سپاہی ہوں۔ آپ مجھے صرف محمود کہا کریں۔ وہ کہنے لگے دیکھو چچا محمود آپ میری یونٹ کے نہیں ورنہ میں آپ کو سپاہی محمود کہتا۔ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہو۔ بے شک آپ فوج میں ہیں مگر میں آپ کے ہاں مہمان بن کر آتا ہوں۔ آپ میرے بھانجوں کی خدمت کرتے ہو ان کا خیال رکھتے ہو اس لئے آپ کا احترام لازم ہے۔ 1999ء کی کارگل جنگ سے پہلے کرنل ایوب صاحب کی پوسٹنگ آزاد کشمیر کے باغ سیکٹر میں ہوگئی اور میں ان کے بچوں کے ساتھ چکلالہ میں رہتا تھا۔ اس دوران میں گھر چھٹی پر گیا تو میرا ایک عزیز رشتہ دار لاہور میں حادثہ کا شکار ہوگیا۔ مرحوم کا دوسرا بھائی سپاہی مظہر اقبال 12 پنجاب رجمنٹ میں تھا جو اس وقت چمن بارڈر پر تھی۔ میں نے کیپٹن جاوید اقبال صاحب سے کوئٹہ بات کی تو کیپٹن صاحب اسی وقت 12 پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر کرنل اسرار خان خٹک کے پاس چلے گئے جو اس روز کوئٹہ میں موجود تھے۔ آپ نے سپاہی مظہر کی چھٹی کا بندوبست کر کے اس کیلئے ہوائی جہاز اور ریل کے ٹکٹ کا بھی بندوبست کیا تا کہ وہ اپنے بھائی کے جنازے میں شرکت کر سکے۔ کوئٹہ سے جہاز دن کے ایک بجے اُڑتا تھا اس لئے وہ چمن سے بروقت کوئٹہ نہ پہنچ سکا۔ کیپٹن صاحب نے مظہر سے

ملاقات کی اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے ریل پر سوار کر کے گھر بھجوا دیا۔کیپٹن جاوید اقبال شہید نے مختصر مگر نیک جذبات اور شیریں احساسات سے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ شارع زندگی کے ہر قدم پر اپنے کردار وعمل کے گہرے نقوش چھوڑ گئے جو دوسروں کیلئے محض واقعات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ دستور عمل بھی ہیں۔

کیپٹن جاوید اقبال شہید جب سفر شہادت پر روانہ ہوئے تو اللہ نے مجھے بھی کچھ دیر تک ان کی ہم سفری کا اعزاز بخشا کیپٹن صاحب جب اپنے گھر دبلہاہ راجگان سے کارگل کیلئے روانہ ہوئے تو میں بھی چندروزہ رخصت کے بعد راولپنڈی جارہا تھا راستے میں ہم اکھٹے ہوئے اور پھر چکلالہ تک ہمارا ساتھ رہا۔ وہ چکلالہ آفیسرز مس چلے گئے اور رات کو پھر ملنے آئے تو میں نے انہیں شربت پلایا۔ہم سب سے مل کر اگلی صبح وہ بذریعہ ہیلی کاپٹر سکردو چلے گئے۔

5 اگست 1999ء کی شام چکلالہ میں مجھے ہی سب سے پہلے ٹیلی فون پر سکردو سے اطلاع دی گئی کہ کیپٹن راجہ جاوید اقبال میدان جنگ میں دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ میں نے ٹیلی فون کرنے والے کیپٹن صاحب کو بتایا کہ کرنل ایوب صاحب کی فیملی گاؤں میں ہے تو انہوں نے مجھ سے گاؤں کا نمبر لیکر انہیں اطلاع کی۔کیپٹن صاحب کا جسد خاکی چکلالہ آنے تک میں وہی رہا اور اللہ نے مجھے شہید کی ہمسفری کا پھر موقع دیا اور میں جس ہنستے مسکراتے نوجوان کے ساتھ چکلالہ آیا تھا اسے 8 اگست کی شام کو میر پور کوٹلی روڈ کے کنارے واقع قبرستان میں آخری سلامی دیکر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت کر دیا۔

آج بھی جب میں کیپٹن صاحب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوتا ہوں تو ان کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات میرے ذہن پر فلم کے طرح چلنے لگتے ہیں۔کیپٹن جاوید اقبال شہید کی قبر کے سرہانے لگے کتبے پر ھوالباقی کے الفاظ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ زندگی واقعی عارضی ہے باقی صرف اسی کا نام رہے گا جو اس کائنات کو پیدا کرنے والا ہے۔

کاش! ہر شخص کو یہ احساس ہو اور وہ کیپٹن جاوید اقبال شہید جیسے لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے ہمیشہ باقی رہنے والی ہستی کے حکم کے تابع اپنی زندگی گزارے اور اس کا خاتمہ بھی خیر پر ہو۔

سپاہی محمود احمد
1- آزاد کشمیر رجمنٹ
(لاہور کینٹ)

گر میں شہید ہو گیا تو

گر میں شہید ہو گیا تو۔۔۔۔۔
میرے وجود کو میری مٹی میں
آسودہ خاک کر دینا
میں شہید راہ حق ہونگا
میرے لئے کوئی آنسو نہ بہانا
میرے وطن کے سب بچوں سے کہنا
کہ ہم نے تمہارے مستقبل کی خاطر
جان راہ حق میں دی ہے
تم نے وطن کو بچا کے ہے رکھنا
علم کو اونچا اٹھا کے ہے رکھنا
سنو میرے نوجوانوں سے کہنا
ان کو بھی ہے تیار رہنا
دشمن سے نگاہیں ہیں ان کو لڑانی
جانثاری کی رسمیں ہیں ان کو نبھانی
نئے حکمران یہی تو ہونگے
اس زمین کا آسمان یہی تو ہونگے
میری خاک پہ چل کے جب یہ آئیں گے
مجھ کو رستے میں یہ پائیں گے
کیونکہ میں شہید راہ اللہ ہوں
میں دیں کی خاطر باطل سے لڑا ہوں

میں جانتا ہوں کہ میرے گھر کے سب افراد
میری بہنیں میرے بھائی میرے ہمزاد
گریہ وکناں ہیں میری جدائی میں
روتے ہیں سب تنہائی میں
ان سب کو میری جانب سے کہنا
میرے محسنو میں تو زندہ ہوں ہر دم
میں جا رہا ہوں اپنے اللہ کے پاس
نہ ہونا کوئی بھی کبھی بھی اداس
میں گر مٹ گیا تو اس میں کیا برا ہے۔
میں سپاہی تھا سپاہی دشمن سے لڑا ہے۔
میں شہید راہ حق ہو چلا ہوں
میں خود روشنی کی خاطر جلا ہوں۔۔۔۔۔

انوار ایوب راجہ

کتابیات

تاریخ خلافت اسلامی	جناب محمد نورالدین اویسیؒ کشمیری
راج ترنگنی	پنڈت کلہن
عکس کشمیر	ڈاکٹر صابر آفاقی
پاکستان کا مطلب کیا	جناب محمد نورالدین اویسیؒ کشمیری
تاریخ اقوام پونچھ	محمد دین فوق
تاریخ اقوام کشمیر	محمد دین فوق
جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں	جی۔ایم۔میر
تاریخ شاہان گجر	ابوالبرکات مولانا عبدالمالک
ارتھ شاستر	محمد اسماعیل ذبیح
کشمیر آن کراس فائیر	وکٹوریہ شوفیلڈ
کشمیر لداخ اینڈ زنسکار	مارگریٹ اینڈ رولف شٹلر
تاریخ جموں	مولوی حشمت اللہ
تبصرۃ الاعوانیہ	مولوی عبداللہ ابن جنگ باز
تاریخ راجگان جموں وکشمیر	ٹھاکر کاہن سنگھ
تاریخ راجپوتان پنجاب	ٹھاکر کاہن سنگھ
آئین اکبری	
شجرہ راجگان جموں	راجہ تانو خان ذیلدار
شجرہ اقوام کشمیر	راجہ تانو خان ذیلدار
نارمہ راج	کیپٹن سریندر کمار نارمہ
راجپوت گوتیں	چوہدری محمد علی

لارڈز آف پنجاب	لیپل گریفن
ملٹری اینڈ پولیٹیکل لیڈرشپ	جیکب گراہم
کشمیر اُداس ہے	محمود ہاشمی
تاریخ قوم راجپوت	شہادت علی خان کھچی چوہان
امبل	محمد سرور امبل
عکاس راجپوت	شاہد منظور بھٹی
راجپوت قبائل	راجہ محمد عارف منہاس

ان کتابوں اور بیشمار قلیم نسخوں، خطوط اور دیگر دستاویزات کے مطالعہ کے لئے رہنمائی اور ان کی دستیابی کے لئے میں اپنی والدہ محترمہ اور جناب جی ایم میر، جناب ممتاز احمد ہاشمی ایڈووکیٹ اور محترمہ وقار اُنزیب ڈپٹی کمشنر نوشہرہ کا بے حد ممنوں ہوں جن کی شفقت اور سرپرستی سے شہید کی تاریخی سوانح حیات مکمل ہوئی۔

میں ان سب احباب خصوصاً شہید کے دوستوں کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیت کے باوجود شہید کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا۔

انوار ایوب راجہ

anwaar@anwaarraja.co.uk

www.anwaarraja.co.uk

دیگر تصانیف

تمہارے بعد	شعری مجموعہ
ھلال کشمیر	سوانح نائیک سیف علی جنجوعہ
	ھلال کشمیر/نشان حیدر
لینٹھا	سوانح کرنل عبدالحق مرزا
	(شیر جنگ) مجاہد جنگ آزادی کشمیر

میری وزارت عظمٰی (زیر طبع)

میں اور وہ (زیر طبع)

سربکف

انوار ایوب راجہ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	سربکف
مصنف	انوار ایوب راجہ
اشاعت دوئم	2008ء
ٹائیٹل	ولّی
ناشر	پینٹر آف دی ڈے پبلشرز (لوٹن یو کے)
قیمت	-/299 روپے۔ برطانیہ 10 پونڈ

ملنے کا پتہ:

مکتبہ رضوان نزد بینک سکوائر میرپور آزاد کشمیر

دی بک سنٹر ایکسپریس ہاؤس وائٹ ابے روڈ بریڈفورڈ

0127472864 BD8 8EJ (UK)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح حیات

کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید (تمغہ بسالت)

انتساب

☆شہدائے کارگل کے نام☆

دردانسان کوزندگی کا قرینہ جاننے کا درس دیتا ہے اور ظاہری و باطنی روپ سے آشنا کرتا ہے۔ دردمند انسان ہماری زندگی کا جوہر ہوتے ہیں۔"سربکف" کا مطالعہ کرنے کے بعد انوارایوب راجہ کے درددل اور زندہ دکھ کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔میرے لئے یہ کہنا بجا ہے کہ درد کوانوارایوب جیسے دردمند ہی محسوس کر سکتے ہیں

"سربکف" کیپٹن راجہ جاوید اقبال کی مختصر مگر بھر پور اور فخر یہ زندگی کی کہانی ہے۔ایسے لوگ بلاشبہ قابل عشق اوران کا رستہ منزل پر پہنچنے اور کامرانی کا ہوتا ہے۔یہی وہ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جوزندگی کا راز جان لیتے ہیں۔کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نہ صرف جاننے والوں میں ہونگے بلکہ ماننے والوں میں بھی چونکہ کیپٹن راجہ جاوید اقبال راز زندگی جاننے والوں میں سے تھے اور ہیں "ہیں"اس لئے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

ایسے موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا کیونکہ یہ قلم قبیلہ کا خاصہ رہا ہے۔لیکن جوانداز تحریر کتاب کے مصنف نے اپنایا ہے وہ قاری کومجبور کرتا ہے کہ کتاب پڑھنا شروع کرتے ہی ہر کام چھوڑ دے اور کوئی بھی کام معمولات زندگی کا تب کیا جائے جب کتاب کا آخری صفحہ پڑھتے ہوئے مکمل ہو۔انوارایوب کی تحریر میں سادگی اور پرکاری ساتھ ساتھ چلتیں ہیں۔کتاب کی زبان ایسی ہے جسے ہرنوعیت کا قاری نہ صرف پڑھ سکتا ہے بلکہ مفہوم بھی سمجھ لیتا ہے۔یہی مصنف کا کمال ہے کہ وہ اپنا پیغام پہنچانے کا گُر جانتا ہے۔ہرصفحہ انسانی سانس، ہوا کے جھونکے،صحرا کے ذرے اور درد کے ادلتے بدلتے نقوش سے بھر پور ہے۔

میری انوار ایوب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔لیکن اس کی تصنیف "سربکف" کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے لئے ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ انوارایوب زندگی کے دکھ اور سکھ سے باخبر شخص ہیں۔تبھی تو ان کی تحریر میں سب کچھ ملتا ہے۔تاریخ ملتی ہے،سیاست کا ذکر ہوتا ہے،روایات کی بات ہوتی ہے،لسانیات کے حوالے ملتے ہیں اوراَدبی انداز ملتا ہے۔مصنف کی زبان کی شیرینی قاری کو مصنف کا مداح بناتی ہے۔

(حمید خٹک ایڈووکیٹ)

تعارف: حمید خٹک کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع کرک سے ہے۔آپ انگریزی زبان وادب کے استاد ہیں اور کئی ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں کالم لکھتے ہیں۔بین الاقوامی اموراور سیاسیات پران کے کئی تحقیقی مضامین منظر پر آچکے ہیں۔آپ کی تصانیف میں انگریزی شعری مجموعہ "The Full Moon" اور "عدلیہ رسوائی سے بحالی افتخار تک" نے بہت شہرت پائی۔

سخنِ درویش

انوار ایوب راجہ شاعر اور کہانی نگار ہونے کے علاوہ ایک دردمند وطن دوست بھی ہیں جنہیں کشمیر کی مٹی اور اس کی بو باس کے علاوہ اس کے باسیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ کئی سالوں کی غریب الوطنی کے باوجود ان کے خیالات اور سوچ میں وطن کی خوشبو آتی ہے اور وہ کشمیر کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

ایک شعری مجموعے اور کئی افسانوی تحریروں کے علاوہ انہوں نے "ھلال کشمیر" "لینٹھا" اور "سربکف" کے نام سے تین کتابیں منظر عام پر لائیں۔ لینٹھا کشمیر کے ایک مجاہد کرنل عبدالحق مرزا کی ڈائری ہے جو کشمیریوں کے ساتھ ہونے والے سوتیلے سلوک کی نشاندہی کرتی ہے۔ "ھلال کشمیر" ایک دلیرانہ کاوش ہے جس میں مصنف نے مجاہدین کشمیر کو دیئے جانے والے جنگی اعزازات کا ذکر کرتے ہوئے اس دکھ کو اجاگر کرنے کی کوشش کہ ان اعزازات اور کشمیری مجاہدین کی قربانیوں سے نہ تو پاکستان کی عوام باخبر ہیں اور نہ ہی صاحبان اقتدار اور اہل قلم وعلم کی نظروں میں کشمیریوں کے خون کی کوئی قدرو اہمیت ہے۔ جبکہ "سربکف" ایک ایسے کشمیری کی داستان ہے جو برصغیر کی Painful Legacy کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی ہے اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آ رہا ہے۔

کشمیر کی تاریخ میں بے شمار افراد سیاست گری کا شکار ہو گئے اور تاریخ کی تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔ انوار ایوب راجہ تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف کشمیر سے محبت کی ہے بلکہ مائیہ ناز فرزندان کشمیر کو تاریخ کے بے رحم اور عمیق اندھیروں سے نکال کر صفحہ قرطاس کی زینت بنا دیا۔

امید ہے کہ کشمیریات میں دلچسپی رکھنے والوں کیلئے "سربکف" ایک بہترین اضافہ ہوگا اور انوار ایوب راجہ آگے بھی اپنے مطالعات اور تجربوں کی روشنی میں اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں گے۔

(مرتضٰی شبلی)

تعارف: لندن میں مقیم کشمیری دانشور، تجزیہ نگار اور شاعر جناب مرتضٰی شبلی کا تعلق شہیدوں اور ولیوں کی سرزمین سرینگر سے ہے۔ سکیورٹی اور سیاسی تجزیہ نگار کی حیثیت سے آپ بہت سے ٹیلیویژن چینلوں اور اخبارات سے منسلک رہے ہیں۔ مرتضٰی شبلی ماہنامہ کشمیر افیئرز کے ایڈیٹر انچیف ہیں۔ بحیثیت سیاسی مفکر اور تجزیہ نگار آپ برداشت، رواداری، انسان دوستی اور جمہوریت کے علمبردار ہیں۔ آپ کا انداز بیاں مدلل، دلنشین اور سادہ ہے۔ آپ اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ جب تک مسئلہ کشمیر کا منصفانہ اور پائیدار حل نہیں ہوتا جنوبی ایشیاء میں امن، ترقی، استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔

انوار ایوب راجہ صحافت کی تعلیم حاصل کرنے برطانیہ آئے اور ڈگری مکمل کرنے سے پہلے ہی میدان عمل میں آ گئے۔ انوار ایوب راجہ نے تعلیم تو انگریزی زبان میں حاصل کی مگر صحافت کے انگریزی فن و ہنر کو اردو کے حسین رنگوں میں سمو کر نہ صرف اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے اوراق کو زینت بخشی بلکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنے الفاظ اور خیالات کو گزشتہ کئی سالوں سے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنائے ہوئے ہیں۔

انوار ایوب راجہ رہتے تو برطانیہ میں ہیں مگر کشمیر اور کشمیریت ان کی روح میں بسی ہے۔ انوار کے قلم و علم سے نہ صرف کشمیر کی مٹی کی خوشبو آتی ہے بلکہ ان کے الفاظ اور آواز میں بھی پیغام امن و محبت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نوجوان صحافی انوار ایوب راجہ کئی خوبیوں کے مالک ہیں جنہیں چند سطروں میں بیان کرنا آسان نہیں۔

انوار کی تصانیف میں "ہلال کشمیر" "لینٹھا" اور زیر نظر "سر بکف" نمایاں ہیں۔ "ہلال کشمیر" جنگ آزادی کشمیر کے نامور مجاہد نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کی سوانح حیات ہے۔ "ہلال کشمیر" جنگ آزادی کشمیر کا سب سے بڑا جنگی اعزاز ہے جسے پاکستان میں نشان حیدر کے مساوی قرار دیا گیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود پاکستان کا کوئی بھی شہری بشمول سول و ملٹری بیوروکریسی اور اعلیٰ سیاسی اشرافیہ کے شہید سیف علی جنجوعہ اور ان کے جنگی کارنامے اور اعلیٰ ترین جنگی اعزاز سے واقف ہی نہیں تھا۔ انوار ایوب راجہ شعبہ صحافت کا پہلا مجاہد ہے جس نے سیف علی شہید کی زندگی پر تحقیق کر کے ان کے جنگی کارنامے اور جنگی اعزاز کو کتابی شکل میں پیش کیا جو کہ اہلیان کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے مضمون میں دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک نادر تحفہ ہے۔ "لینٹھا" جنگ آزادی کشمیر کے ایک جانثار مجاہد کرنل عبدالحق مرزا کی جنگی ڈائیری پر مبنی انتہائی اہم اور منفرد کاوش ہے جو بہت سے خودساختہ جہادی لیڈروں اور بہروپیوں کے اصل چہروں سے اہل کشمیر کو روشناس کرواتی ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ کشمیر اور کشمیریات پر لکھنے والوں اور نام نہاد کشمیر کانفرنسوں اور سیمیناروں پر مقالے پڑھنے والوں کو کبھی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ وہ یکم جنوری 1949ء کی فائیر بندی، پاک فوج کی مجاہدین کے مفقوحہ علاقوں سے دشمن کو دیکھے اور لڑے بغیر پسقدمی اور سردار عبدالقیوم خان اور ان کے ساتھیوں کی

پونچھ شہر کے طویل محاصرے میں ناکامی کا ذکر کریں۔

کشمیریوں کی صدیوں پر محیط غلامی کے تسلسل میں صرف بھارتی حکومت اور حکمران ہی نہیں بلکہ آزادی کشمیر کے نام نہاد چمپئین اور آزاد کشمیر کو ذاتی جاگیر سمجھ کر آزاد کشمیر کے عوام کو مسلسل ساٹھ سال تک لوٹنے والے حکمران اور پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے ایجنٹ بھی برابر کے مجرم ہیں۔لینٹھا ایک کشمیری مجاہد چوہدری محمد حسین کا لقب تھا۔لینٹھا کے معنی پہاڑی عقاب کے ہیں اور چوہدری محمد حسین واقعی ایک عقاب تھا جسے قدرت نے جرأت، غیرت اور جوانمردی جیسی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا۔

"سربکف" انوارایوب راجہ کی بیمثال صحافتی، ادبی اور تاریخی کاوش ہے۔ بظاہر یہ کتاب کارگل کے محاذ پر جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرنے والے نوجوان کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید تمغہ بسالت کی سوانح حیات ہے مگر انوار نے اسے تاریخی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور روحانی رنگ میں پیش کر کے ایک عام قاری سے لیکر تاریخ، سیاسیات اور روحانیت کے طالب علموں کیلئے بھی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

سربکف ایک ایسے مجاہد کی داستان حیات ہے جو پیدا تو برطانیہ میں ہوا مگر اس کا روحانی رشتہ اپنے باپ دادا کی مٹی سے کچھ اس طرح جڑا ہوا تھا کہ مغربی مادی ماحول و معاشرت کی کشش اس پر اثر انداز نہ ہو سکی۔کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید کی زندگی مغربی تہذیب و معاشرت میں رہنے والے پاکستانیوں اور کشمیریوں خاص کر نوجوان نسل کیلئے مشعل راہ ہے۔

"سربکف" کشمیر اور کشمیریات کے مضمون میں دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک انتہائی مفید اور معلوماتی کتاب ہے۔امید ہے کہ انوار ایوب جیسا باجرأت صحافی اور وطن سے محبت کرنے والا نوجوان لکھاری آئندہ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتا رہیگا۔

(ڈاکٹر شبیر چوہدری)

تعارف: ڈاکٹر شبیر چوہدری کا تعلق ضلع بھمبھر آزاد کشمیر سے ہے۔آپ طویل عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔آپ کا شمار جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے بانی قائدین میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر شبیر چوہدری ڈپلومیٹک کمیٹی کے چیئرمین اور انٹرنیشنل کشمیر الائنس کے ترجمان اور روشن خیال سیاسی مفکر ہیں۔آپ نے کشمیر کے سیاسی ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔تاریخ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے متعلق آپ کی کئی کتابیں، کتابچے اور مضامین منظر عام پر آ چکے ہیں۔ڈاکٹر چوہدری نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے تنازعہ کشمیر کے منصفانہ اور پائیدار حل کیلئے عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے میں جرأتمندانہ خدمات سرانجام دی ہیں۔

ایفائے عہد

13 اگست 1998ء کی صبح پیغام ملا کہ کیپٹن جاوید مجھے اور شہر یار کو کوئٹہ بلا رہے ہیں۔ابھی میں اس پیغام کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کوئٹہ سے فون پر حکم ملا کہ کل دو پہر تک تم دونوں کوئٹہ پہنچ جاؤ چونکہ میں نے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ہوسکتا ہے میں اس کے بعد دو یا تین ماہ کے لئے انگلینڈ چلا جاؤں اور واپسی پر میری پوسٹنگ سیاہ چن ہونے کا چانس ہے اس لئے بات کرنے کا وقت نہیں ملے گا۔پھر کہا کہ تم دونوں کی سیٹیں بک کروا دیں ہیں پی آئی اے کے دفتر سے اپنی ٹکٹیں بھی لے لو میں کل ایئرپورٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔

اگلے روز میں اور شہر یار میر پور سے اسلام آباد اور پھر کوئٹہ پہنچے تو ہمیشہ کی طرح مسکراتا ہوا مہربان چہرہ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔کیپٹن جاوید نے ہمارا سامان خود اٹھا کر گاڑی میں رکھا اور پھر نہایت ہی شفقت سے ہمیں لیکر آرٹلری میس پہنچے۔آرٹلری میس پہنچ کر وہ وہاں اتر گئے اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہمیں خضدار ہٹ میں پہنچا دے۔چلتے وقت کچھ ہدایات دیں اور شام آٹھ بجے کوئٹہ سروسز کلب پہنچنے کا کہہ کر ہمیں رخصت کیا۔آٹھ بجے جب ہم سروسز کلب پہنچے تو ہمیشہ کی طرح وقت پر پہنچنے والا شخص ہمارا منتظر تھا۔ابھی ہم اپنی نشستوں پر بیٹھے ہی تھے کہ کیپٹن جاوید مجھ سے مخاطب ہوئے اور سوال کیا کہ آج کے دن کی کیا اہمیت ہے۔میں نے عرض کی کہ آج چودہ اگست ہے اور یوم آزادی ہے پھر کہنے لگے چلو آج ہم یوم آزادی کا جشن کیک کاٹ کر مناتے ہیں۔ابھی ان کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ ویٹر دو بڑے کیک لایا۔کیک دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ چودہ اگست کی دوسری اہمیت کیا ہے۔میں نے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹا اور کیپٹن جاوید نے کھڑے ہو کر کیک پر بنے پاکستان کے جھنڈے کو سلیوٹ کیا اور پاکستان کی آزادی کی سالگرہ کا کیک کاٹ کر ویٹر کو واپس کر دیا۔ویٹر نے پوچھا کہ جناب اس کیک کا کیا کرنا ہے تو فرمایا آپ لوگ کھائیں یہ آپ کے لئے ہے۔ویٹر کیک اٹھانے لگا تو اسے روک کر کہا کہ یہ پاکستان کی سالگرہ کا کیک ہے پھر ایک ٹکڑا کاٹ کر خود کھایا اور کہا لے جاؤ اور سب مل کر ملک کی ترقی اور سلامتی کے

لئے دعا مانگو۔

ویٹر پاکستان کی سالگرہ کا کیک لیکر چلا گیا اور میں کیپٹن جاوید کی وطن سے محبت اور سادگی کے متعلق سوچنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا شہر یار نے کہا ماموں جی آپ کو پاکستان میں رہتے ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں آپ اس ملک کے متعلق کیا جانتے ہیں۔

کیپٹن جاوید بولے! شاید میں اس ملک کے وجود کے متعلق تو کم جانتا ہوں مگر اس کی روح میرے خون میں بس گئی ہے۔ بس تھوڑی محنت اور اصلاح کی ضرورت ہے ورنہ یہ ملک جنت ہے۔ کہنے لگے میں نے بہت سی کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں جن میں ملکی ترقی اور استحکام کے متعلق لکھا گیا ہے مگر جو تجاویز حضرت قبلہ پیر صاحب محمد نور الدین اویسیؒ نے اپنے مضمون ''پاکستان کا مطلب کیا'' میں پیش کی ہیں ان پر عمل کئے بغیر ہم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔ جو کچھ قبلہ صوفی صاحبؒ نے لکھا ہے اسی پر عمل پیرا ہو کر ترقی یافتہ قومیں آج بام عروج پر ہیں۔ قبلہ نے جس انداز سے سادگی، مساوات، کردار کی پختگی، اصول پسندی اور عدل وانصاف کی فراہمی کا ذکر کیا ہے اس پر عمل کرنا آسان ہے مگر اس طرف متوجہ ہونا انتہائی مشکل ہے۔

ہماری قیادت عیش طلب ہے جو ہمیشہ عوام سے قربانی مانگتی ہیں جب قیادت سادہ، باکردار، اصول پسند اور عادل ہوگی تو پاکستان کا مطلب سب پر عیاں ہو جائے گا۔ ہماری محرومیاں اور مجبوریاں ختم ہو جائیں گی اور ہم دنیا کے قائد بن جائیں گے۔ کیپٹن جاوید کے پسندیدہ مضامین میں تاریخ، روحانیت اور تحقیقی مقالہ جات شامل تھے۔ وہ نیشنل جیوگرافک اور یو ایف او باقاعدگی سے انگلینڈ سے منگواتے اور پھر پورے انہاک سے مطالعہ کرتے۔ ملٹری اینڈ پولیٹیکل لیڈر شپ پر ایک پرانا مقالہ جو انہیں کسی دوست نے دیا تھا کے متعلق ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کے امریکن آرمی میں پروموشن سسٹم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ گو کہ ویسٹ میں اس چیز کا پرچار نہیں اور نہ ہی یہ بات عام آدمی تک پہنچتی ہے کہ کس طرح ایک کیڈٹ کو جنرل بننے تک پرکھا جاتا ہے اور ہر قدم پر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کے خاندان اور نسل پر نظر رکھی جاتی ہے نہ کے صرف تعلیم اور ظاہری چمک دمک کو دیکھا جاتا ہے۔ برٹش اور امریکن آرمی میں جب کوئی نوجوان آفیسر بننے کے لئے درخواست دیتا ہے تو کئی ماہ تک اس کی درخواست پر غور

ہوتا ہے اور نسل خاندان اور خاندانی روایات اور تاریخی واقعات کو پرکھنے کے بعد درخواست کو شرف قبولیت بخشا جاتا ہے۔ کاروباری طبقے کے نوجوانوں کو ایمرجنسی کے علاوہ فوج میں سپاہی بھی بھرتی نہیں کیا جاتا چونکہ یہ پیشے صدیوں کی محنت سے پختہ کار ہوتے ہیں اور ایسے خاندانوں کے نوجوان فوجی ذہن نہیں رکھتے۔

جس طرح اہل مغرب اپنی فوجی قیادت کے چناؤ کو اہمیت دیتے ہیں ویسے ہی وہ اپنی سیاسی قیادت کے معاملے میں بھی انتہائی حساس ہیں۔ شراب خانوں اور جوأ خانوں کے گرد گھومتی یہ قومیں اپنی قیادت کو ہمیشہ معاشرتی قباحتوں سے دور رکھتی ہیں اور ان کے کردار و اخلاق میں ذرہ بھر لغزش برداشت نہیں کرتیں۔

کافی دیر تک ان موضوعات پر باتیں کرنے کے بعد جب ہم سروسز کلب سے اٹھنے لگے تو کیپٹن جاوید نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ میں نے عرض کی کہ کچھ روز پہلے نکیال گیا تھا وہاں نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کے خاندان سے ملاقات ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تحریک آزادی کشمیر کے اس ہیرو پر کچھ لکھوں۔ میری بات سن کر کہنے لگے کہ ہوسکتا ہے تمہیں اس سے پہلے مجھ پر لکھنے کا موقع مل جائے۔ اس وقت میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا مگر میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس شخص نے ابھی اپنی زندگی کا آغاز ہی کیا ہے مگر ہر وقت انجام کی باتیں کیوں کرتا ہے۔ مگر کیا پتہ تھا کہ اس کی زندگی جتنی بھرپور اور تیز و تند ہے اتنی ہی بامعنی اور مختصر بھی ہے۔ چلتے وقت میں نے عرض کی کہ آپ کے متعلق کیا لکھا جا سکتا ہے تو کہنے لگے وقت آیا تو ضرور لکھنا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے وعدہ کرو کے ضرور لکھو گے۔ میں نے جواب دیا۔

وعدہ رہا۔۔۔

یہ وقعہ ہوا اور گزر گیا جسے تب کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ انسان اپنی عام زندگی میں کئی بار ایسی باتیں کر جاتا ہے جس کا تعلق اسکے جذبات سے تو ضرور ہوتا ہے مگر ایسی باتوں کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ کیا پتہ تھا کہ کیپٹن جاوید اقبال جیسے لوگ بھی اس دنیا میں آتے ہیں جن کے الفاظ سطحی اور جذباتی نہیں بلکہ حقیقی ہوتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جن کی زندگی بامعنی اور مقصدیت سے بھر

پورہوتی ہے۔

8 اگست ۱۹۹۹ء کی شام جب کیپٹن جاوید اقبال شہید کا جسد خاکی لحد میں اتارا جارہا تھا تو مجھے شہید کے ساتھ ۱۴ اگست ۹۸ء کی شام کو کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ آج ان کی دوسری برسی کے موقع پر میں اپنا عہد نبھاتے ہوئے (سربکف) کا تحفہ ان کی نذر کرتا ہوں۔

انوار ایوب راجہ
anwaar@anwaarraja.co.uk
www.anwaarraja.co.uk

فہرست

1.	حرف اوّل	....	....	....	1
2.	تاریخی مبالغے	....	....	....	5
3.	ملکی وحدت پر اثرات	....	....	....	10
4.	فرمان نبویﷺ	....	....	....	14
5.	قومی وقار پر اثرات	....	....	....	15
6.	تاریخ نارمہ	....	....	....	18
7.	نارمہ کی وجہ تسمیہ	....	....	....	19
9.	رانی نارمہ	....	....	....	23
9.	غرض بیان	....	....	....	24
10.	جنجوعہ اور بھٹی تاریخ پر ایک نظر	....	....	....	27
11.	راجگان نرماہ	....	....	....	33
12.	راجہ سخی ولائت خان سفید پوش وذیلدار	....	....	....	35
13.	تحریک آزادی کشمیر میں شمولیت	....	....	....	39
14.	جنگ آزادی میں راجہ صاحب کی خدمات	....	....	....	42
15.	لیفٹینٹ راجہ مظفر خان شہید	....	....	....	44
16.	الحاج راجہ بشیر احمد خان	....	....	....	47
17.	روزگار فرنگ	....	....	....	50
18.	الحاج راجہ بشیر احمد خان کا گھرانہ انگلینڈ میں	....	....	....	53
19.	جذبہ شہادت	....	....	....	57

20.	ینگ مسلم سوسائٹی	....	....	....	58
21.	جاوید بطور ینگ مسلم	....	....	....	59
22.	ینگ مسلم میدان عمل میں	....	....	....	61
23.	پاکستان میں آمد	....	....	....	63
24.	یونٹ کے شب و روز	....	....	....	67
25.	شادی	....	....	....	69
26.	انگلینڈ کا آخری سفر	....	....	....	74
27.	الوداعی ہیون آف دی ہیونز	....	....	....	77
28.	آخری چھٹی	....	....	....	80
29.	سفر شہادت	....	....	....	82
30.	رجمنٹ ہیڈ کوارٹر میں آمد	....	....	....	83
31.	ربانی ۔۲	....	....	....	85
32.	شہید کی واپسی	....	....	....	89
33.	میں واپس نہیں آونگا	....	....	....	93
34.	کچھ یادیں کچھ باتیں	....	....	....	100
35.	شاہ جی خدا حافظ	....	....	....	105
36.	زندہ جاوید	....	....	....	108
37.	سنہری یادیں	....	....	....	109
38.	سربکف	....	....	....	121
39.	ھُوالباقی	....	....	....	124
40.	گر میں شہید ہو گیا تو	....	....	....	127
41.	کتابیات	....	....	....	129